www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آوارگی

جاوید دانش

urdukutabkhanapk.blogspot
www.urdukutabkhanapk.blogspot.com



آوارگی

[سفرنامہ]

۱۹۸۲ء

——— جاوید دانش

کتاب گھر کی پیشکش
http://www.kitaabghar.com
urdukutabkhanapk.blogspot.com



جملہ حقوق بحق احمد ریاض محفوظ ہیں

پہلی بار	:	اگست ۱۹۸۷ء
دوسری بار	:	اگست ۲۰۰۶ء
تعداد	:	۱۰۰۰ (ایک ہزار)
کمپوزنگ	:	تسلیم عارف، موبائل:09339116285
ترتیب وتہذیب	:	احتشام جمیل
طباعت	:	پرنٹ ویل آفسیٹ، ۳۸رمیکلوڈ اسٹریٹ، کولکاتا-۱۷
سرِ ورق	:	محمد طارق
ناشر	:	حنفی ٹرسٹ
قیمت	:	۱۰۰ر روپئے-دس ڈالر

ملنے کا پتہ :

حنفی ٹرسٹ

۱۴ر۱۱، جھاؤتلہ روڈ، کولکاتا-۱۷

رنگ منچ، کینیڈا

825, DENSION ST. UNIT-4
MARKHAM-ON. L3R5E4 CANADA.
Ph. : 905 426 5688 / 905 513 0236
e-mail : j.danish@rogers.com
website : jawaiddanish.com

کتاب گھر کی پیشکش
http://www.kitaabghar.com
urdukutabkhanapk.blogspot.com

اور بھی تیز ہو پرواز جو نیچے دیکھوں
کس بلندی پہ یہ گِر جانے کا ڈر لے آیا

والدہ محترمہ،

کُلثُوم حَنیِف

کی نذر ....

  

...........نلوں پر نہاتی صبح

فائلوں پر جُھکی دوپہر

بس کی بھیڑ میں مدغم شامیں

اور

کھانستی راتوں

کے

نام!

http://www.kitaabghar.com
کتاب گھر کی پیشکش
urdukutabkhanapk.blogspot.com

ترتیب

http://www.kitaabghar.com
urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہم ہیں آوارہ مزاجی کے پیمبر یارو!

ایک زمانہ تھا جب سفر کے نام سے لوگ کانپتے تھے۔ راستے کی صعوبتیں، راہزنوں اور قزاقوں کا خوف اور سست رفتاری! پھر ایک زمانہ آیا کہ مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہونے لگا، وہ بھی تمام تر سہولتوں کے ساتھ —— آج پھر سفر کے نام سے لوگ گھبرانے لگے ہیں۔ تمام آسائشوں اور تفریح کے باوجود یہ خوف غالب رہتا ہے کہ پتہ نہیں کس وقت کون سا جہاز ''ہائی جیک'' ہو جائے اور کس غریب کی جان جائے۔

اسکول سے یونیورسٹی تک میں نے بس ایک خواب دیکھا تھا۔ اس کے لئے بڑی قلمی دوستیاں کی تھیں، برسوں سفر کی تیاریاں کی تھیں لہٰذا تمام ہائی جیکنگ کے خدشات کے باوجود میں نئی دنیا کی کھوج میں نکل پڑنے کے لئے تیار ہو گیا۔

جب میں نے اچانک اپنے سفر کا پلان گھر والوں کے سامنے پیش کیا تو سب بہت پریشان ہوئے۔ مجھے سمجھایا مگر میری ضد سے ہار مان کر مجھے نصف درجن امام ضامنوں سے لیس کر کے تیار کیا گیا —— گویا میں آوارگی کو نہیں سرحد پر جنگ کے لئے جا رہا تھا۔

دوستوں کی دیگر بے جا فرمائشوں کے ساتھ ایک فرمائش تھی کہ خاص خاص چیزیں اور کام کی باتیں نوٹ کرتے جانا۔ بس میں نے جو دیکھا رقم کر لیا اور رفتہ رفتہ یہ رودادِ آوارگی تیار ہوتی گئی۔ تین مہینے اور کچھ دنوں کی آوارگی میں میں نے جو کچھ دیکھا اور تجربہ کیا وہ آپ کے سامنے من وعن حاضر ہے۔ ایک سیٹ پروگرام کے باوجود جہاں مجھے ایک دن رکنا تھا وہاں چار دن رُکا اور جہاں ایک ہفتہ ٹھہرنا تھا وہاں ایک ماہ پڑا رہا! جو روز لکھتا رہا وہ جمع ہوتا گیا۔ جو رہ گیا وہ بھول گیا۔ کچھ مضامین کاہلی اور کچھ ڈاک کی نذر ہوئے۔ جتنا گھر والوں کو ملا جمع کر کے ''اخبارِ مشرق'' کلکتہ کے حوالے کیا جو ۸۲ء میں ہی تقریباً پچیس، تیس قسطوں میں سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوتا رہا۔

اسی سال مغربی بنگال اردو اکادمی کی فیاضی سے میری کتاب ''پرومیتھیئس'' وجود میں آ گئی اور ''آوارگی'' کی اشاعت کا پروگرام ٹلتا رہا اور اسی طرح چار سال گزر گئے۔ اس سالِ سعد ونحس ۸۷ء پتہ نہیں کیسے اور کیوں کر اس کتاب کا مرحلہ تمام ہوا۔

میرے ایک قابل تنقید نگار دوست نے کتاب کا مسودہ دیکھا تو فرمایا :

''یہ کتاب ایسی نہیں کہ اسے ایک طرف ڈال دیا جائے۔ یہ پوری قوت سے دور پھینکنے کے قابل ہے۔''

اب انہیں کون سمجھائے کہ رائٹر صرف تنقید نگاروں کے لئے نہیں لکھتا! ہاں یہ اور بات ہے کہ زیادہ تر فاضل نقاد ہر کتاب کا تمام تر پوسٹ مارٹم کر لینے کے بعد لکھ دیکھتے ہیں :

''..........لیکن کتاب اچھی ہے!'' —— مجھے پتہ نہیں میری ''آوارگی'' آپ کو پسند آئی یا نہیں! اتنا ضرور ہے کہ اس نے میرے لئے نئی دنیا کے دروازے کھول دیئے ہیں۔

آخر میں ان تمام دوستوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے سفر پر اُکسایا اور ان کرم فرماؤں کا ممنون، جن کی دعاؤں کے طفیل میں بخیریت گھر واپس پہنچ گیا۔

''سفر تمام ہوا —— ایک نئے سفر کے لئے''

اگست ۸۷ء

کلکتہ — جاوید دانش

●●●

پیرس جسے کہتے ہیں

مسافروں سے گزارش ہے کہ اپنی سیٹ بیلٹ کس لیں اور سگریٹ نوشی نہ کریں، چند ہی منٹوں میں ہم پیرس اورلی ایئر پورٹ پہنچنے والے ہیں۔ ایئر انڈیا کے ۷۴۷ ''وکر مادتیہ'' کی اڑیسہ رجمنٹ نما ایئر ہوسٹس کی کھنکتی آواز جہاز میں گونجی اور تمام مسافر اس ہدایت پر عمل کرنے کی تیاری کرنے لگے۔ سترہ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے میں چند گھنٹے پہلے کی باتیں، گھر والوں کی خوشی اور گھبراہٹ کے تاثرات، دوستوں کی فرمائشوں کی فہرست اور الوداع، کلکتے کا ٹریفک جام، امام ضامن اور دعائیں، ایکسچینج کی لائن کی چخ چخ اور دیگر در دِسر آہستہ آہستہ بھولنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ آنے والے ہنگاموں سے بے خبر میں بڑی فیاضی سے اپنے ساتھ والی نشست کی مس دیانا کو ہندستانی کلچر پر لکچر دے رہا تھا اور اس کے بدلے پیرس کی ضروری معلومات مثلاً آمدورفت کے وسائل، سستے ریستوراں، فری شو اور (Gypsy-Love) وغیرہ وغیرہ کے متعلق معلومات اپنی ڈائری میں محفوظ کر رہا تھا۔ دیانا ہندستانی تہذیب پر ایک کتاب لکھ رہی ہیں۔ بمبئی اور پونا میں چھ ماہ کے قیام کے بعد پیرس لوٹ رہی تھیں، حسن اتفاق کہ میرے ساتھ کی سیٹ پر جلوہ افروز تھیں۔ میری فری لانس تقریر سے کم اور داڑھی سے زیادہ مرعوب، ویسے بھی باہر والے داڑھی والوں کو اچار یہ رجنیش فیملی کا سمجھتے ہیں۔ ہائے کیا زمانہ تھا جب داڑھی عالم یا آرٹسٹ کی پہچان تھی۔ آج داڑھی جنسی بھگوانوں اور تشدد کے علمبرداروں Terrorism کی نشاندہی کرتی ہے۔ ایک کرخت آواز نے میری سوچوں کا سلسلہ منقطع کیا ''معزز مسافر حضرات! میں کیپٹن شرما آپ سے ہمکلام ہوں، امید ہے کہ آپ کا سفر پُر لطف اور آرام سے کٹا ہوگا، ہم مشکور ہیں کہ آپ نے ایئر انڈیا سے سفر کیا۔ امید ہے آئندہ بھی آپ ہماری عزت افزائی کریں گے۔'' جہاز پتہ نہیں کب لینڈ کر چکا تھا ایئر پورٹ کے عملے حرکت میں آگئے، بڑی مستانہ چال میں چکر کاٹ کر جہاز رک گیا، تمام لوگ آہستہ آہستہ منزل کی طرف بڑھنے لگے، گیٹ پر کسی ساڑی کا اشتہار بنی ہوسٹس کھڑی تھی، بڑے سلیقے سے کالگیٹ مسکراہٹ بکھیرتی مسافروں کو رخصت کر رہی تھی، میں نے بڑی حسرت سے بھرپور نگاہ اس بناسپتی حسن پر ڈالی، پتہ نہیں کب یہ منظر دیکھنے کو ملے کہ میں پرانی دنیا کو چھوڑ نئی دنیا میں قدم رکھ رہا تھا، جہاز سے نکل کر ہم ایئر پورٹ کی لابی میں پہنچے تو روشنی میں نہائی ہوئی عطر بیز فضا میں کھو سے گئے۔ اس شہر نگاراں کی کشش دل نے محسوس کی۔ سب سے پہلے جو چیز نظر کے سامنے آئی وہ ایک پوسٹر تھا Welcome to Paris سب سے اوپر فرنچ، پھر انگلش، جرمن، اسپینش، ہندی اور آخر میں عربی میں لکھا تھا:

''اھلاً وسھلاً مرحبا''

اسے اللہ کی قدرت کہئے، عربوں کی مقبولیت یا پٹرو ڈالر کا کمال میں نے اس وسیع ہال میں نظر دوڑائی تو کئی جغادری عرب بڑے کروفر سے اپنے مخصوص عبا قبا میں ٹہلتے نظر آئے پھر یکے بعد دیگرے کئی ہوش ربا پوسٹروں سے نظر پھسلتی چلی گئی۔ اچانک میں رک گیا۔ Oh! Calcutta بڑے سے ایک دلکش پوسٹر پر لکھا تھا۔ ساتھ ہی فرانسیسی میں خدا جانے کیا کیا لکھا تھا۔ میں فطری طور پر خوش ہوگیا۔ چلو بھئی! ع ''ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے'' بیگیج کلیم سے اپنا سامان بٹورا، ایک ٹرالی پر لاد کر ہم کسٹم کی طرف بڑھے۔ افسران نے پہلے میرے حلیے یعنی میرے ترنگے سوٹ کو دیکھا پھر پاسپورٹ وغیرہ دیکھ کر مسکرائے اور آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کرنسی ایکسچینج کے کاؤنٹر

پر روپیوں کا تبادلہ کیا اور پھر ایک پبلک فون میں الجھ گیا۔ یہ جان کر دل حلق میں آیا چاہتا تھا کہ جس ہوٹل میں کمرہ بک کرنے کے لئے تار روانہ کیا تھا وہ اب تک پہنچا ہی نہیں۔ ہائے ہندستانی ڈاک! بڑی دیر بعد مجھے مادرِ وطن کا خیال آیا۔ خیر! وہ تار ہی کیا جو وقت پر پہنچ جائے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں، اتنے میں یاد آیا کہ اتفاقاً میں انٹرنیشنل یوتھ ہوسٹل اور YMCA کا ممبر ہوں، وہاں معلوم کیا جائے۔ پوری ڈائرکٹری دیکھ ڈالی مگر نمبر نہ ملنا تھا نہ ملا۔ میں تھک چکا تھا۔ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو ایک آخری ہندستانی سگریٹ میرے غم کو بانٹنے کو تیار ملی۔ سوچا کچھ کش لگایا جائے، گو عادتاً میں سگریٹ نوش نہیں مگر انجانے اسٹیشنوں اور ہوائی اڈوں پر رسماً دھوم پان کرنا نہیں بھولتا۔ میں سگریٹ جلا ہی رہا تھا کہ دیکھا مس دیآنا سامنے سے اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ خراماں خراماں چلی آرہی ہیں۔ میں انہیں ایئر پورٹ کی رونق، عربی پوسٹر اور اوہ کلکتہ وغیرہ کے چکر میں تقریباً بھول چکا تھا۔ بھئی ہم لوگ تو کالکا میل میں ہمسفروں سے بائیس گھنٹہ گفتگو کرتے ہیں، تاش کھیلتے ہیں، ساتھ کھانا بھی کھا لیتے ہیں اور پتہ، فون نمبر وغیرہ بھی ایکسچینج کر لیتے ہیں مگر دہلی پہنچتے ہی سب بھول کر قلی اور ٹیکسی کے چکر میں گم ہو جاتے ہین۔ بس یہی کیفیت میری تھی، میں بھی دیانا کو بھول چکا تھا۔ وہ میرے پاس آکر رکیں۔ تعجب سے پوچھا تم گئے نہیں، معاملہ کیا ہے؟ میں نے بتایا کہ میں تار سے پہلے پہنچ گیا ہوں، اب اسکے آنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ جب انہیں مزید معلوم ہوا کہ مجھے YMCA کا فون نمبر نہیں مل رہا ہے تو کچھ رک کر وہ خوب ہنسیں۔ میں بے وقوفوں کی طرح ان کا منہ تک رہا تھا۔ پتہ چلا کہ یہاں ہر چیز فرنچ میں لکھی ہوئی ہے اور فرنچ میں YMCA کو UCJA کہتے ہیں۔ انہوں نے فون کر کے میری ممبر شپ کا حوالہ دیا اور میرے لئے کمرہ بک ہو گیا۔ اب سب سے پہلے میں نے ایک پیرس گائیڈ اور نقشہ خریدا۔ دیانا نے بتایا کہ باہر ان کے دوست پال گاڑی لے کر آئے ہیں۔ چلئے ان سے تعارف بھی ہو جائے اور ہم آپ کو ہوسٹل تک چھوڑ آئیں۔ مسٹر ژیں پال بڑے خلوص سے ملے، اپنی کار میں بٹھا لیا۔ اس وقت شام کے آٹھ بج رہے تھے مگر سورج پوری شان سے چمک رہا تھا۔ معلوم ہوا یہاں شام ساڑھے نو بجے سورج غروب ہوتا ہے۔ بھئی جب بھی ہوتا ہے خوب غروب ہوتا ہے، مجھے اس سے کیا۔ راستے میں دیآنا نے اپنا فون نمبر دیا اور سمجھا دیا کہ کچھ پریشانی ضرور ہوگی کیونکہ لوگ یہاں عموماً انگلش نہیں بولتے۔ میں نے کام کی باتیں، ضروری پتے اور روزمرہ کے جملے اردو میں اپنی ڈائری میں نوٹ کئے اور ساتھ ہی باہر بھی دیکھتا رہا۔ شہر روایتی طرز کا تھا۔ قدیم محلات نما عمارتیں، شاندار صاف شفاف سڑکیں جس پر گاڑی پھسل رہی تھی، بائیں طرف ایک دریا رواں تھا۔ پتہ چلا یہ دریائے سین ہے اور پیرس اس کے دائیں اور بائیں طرف آباد ہے۔ دور دھند میں لپٹا ہوا ایفل ٹاور نظر آرہا تھا۔ کوئی پندرہ منٹ کے سفر کے بعد ہم ایک عالیشان مکان کے سامنے پہنچے۔ سارا علاقہ ہوٹلوں سے بھرا پڑا تھا۔ ہر شکل ونسل کے سیاح محوِ خرام تھے۔ ہم لوگ YMCA میں داخل ہوئے۔ پہلی منزل پر آفس تھا۔ ایک محترمہ وہاں بیٹھی تھیں، اس سے پہلے کہ وہ اپنی استقبالیہ مسکراہٹ پوری کرتیں میری انگریزی سن کر ناک بھوں سکوڑنے لگیں مگر دیانا نے اسے فرنچ میں سمجھایا اور میری مشکلیں حل ہوئیں۔ تیسری منزل پر مجھے کمرہ ملا اور بتایا گیا کہ پانچویں منزل پر ایک جوڑا آباد ہے اور صرف وہی انگریزی جانتا ہے۔ اگر کوئی دشواری پیش آئے تو انہیں فون کر لوں۔ یہ رہا فون نمبر۔ میں بہت مشکور وممنون تھا۔ دیانا نے بڑی معصومیت سے کہا شکریہ کی ضرورت نہیں دراصل میری ہندستانی کلچر والی کتاب کے سلسلے میں آپ جب تک یہاں ہیں ہمیں مدد ملے گی۔ میں نے بھی سادگی سے جواب دیا: ''مادام ہمارا کلچر تو ایگریکلچر ہے'' Our Culture is agriculture میں کیا آپ کی مدد کر سکوں گا۔ خیر ذرہ نوازی کا شکریہ مگر خبر لیتی رہیں! دیانا دوسری صبح فون کرنے کا وعدہ کر کے چلتی بنیں۔ سامان لے کر میں تیسری منزل پر پہنچا۔ کمرہ کھولا، چھوٹا مگر بہت قرینے کا تھا۔ پیرس میں ستر فرانک کا کمرہ خوش قسمت کو ہی ملتا ہے۔ کمرے کی کھڑکی راستے پر کھلتی تھی۔ سامنے عالیشان ہوٹل اور ہوٹل والے نظر آرہے تھے۔ YMCA کے پرسکون ماحول میں بس ایک چیز کھٹک رہی تھی۔ Common Bath یعنی نہانے کا مشترکہ انتظام۔ خیر اس بہانے فرانسیسیوں کے اتحاد کی وجہ معلوم ہوگئی۔ ظالم نہاتے بھی اجتماعی طور پر ہیں۔ جب میں اس جماعت میں شامل ہونے کو پہنچا تو اردو کا ایک مشہور محاورہ یاد آگیا کہ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے حمام اور لوگ اسم بامسمیٰ ہو رہے تھے۔ میں تنہا غسل کرنے کا بہانہ اور انتظام

تلاش کرنے لگا، معلوم ہوا کہ بدذوق لوگ صبح فارغ ہو سکتے ہیں اور اعلیٰ ذوق والے Attached Bath والا کمرہ لیتے ہیں! سردی شدت کی تھی میں نے لباس تبدیل کیا اور باہر آ گیا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ پیرس کی شب انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ سڑک کے کنارے ریستوراں والوں نے کرسیاں ڈال رکھی تھیں۔ پورا علاقہ ہوٹلوں اور ریستورانوں سے آباد تھا۔ ہر مکان کے نیچے یا تو بار تھا یا پھر کاسمیٹک کی دکان۔ ہر گلی میں دو ایک دکان پر Tabac لکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ تمباکو کی دکان ہے جو ہمارے جنرل اسٹور کی طرح تھی۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی مگر کسی بھی ہوٹل میں داخل ہونے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن پیرس میں خوانچہ والے کہاں؟ آخر ایک مرجھائے ہوئے ویت نامی ریستوران میں داخل ہوا۔ خدا کے فضل سے اس کا ماحول ہمارے محمدی ہوٹل سے کم نہ تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ محمدی ہوٹل میں چیخ و پکار اور قیامت بپا رہتی ہے اور یہاں ویت نام کی جنگ کے بعد کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں نے ایک کونے میں پناہ لی، مدھم روشنی اور پرانے طرز کے فرنیچر مجھ جیسوں کے منتظر تھے۔ میں نے سوچ سمجھ کر ویجی ٹیبل فرائڈ رائس کا آرڈر دیا۔ تیسرے لقمہ تک گلے میں کچھ پھنستا محسوس ہوا۔ میں نے گھبرا کر پانی مانگا۔ بیرا حیرت سے میرا منہ تک رہا تھا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ پانی کے بجائے آپ بیئر لیں، صرف پانچ فرانک یعنی دس روپئے اور پانی فی بوتل دس فرانک یعنی بیس روپئے اور ہاں خبردار نل کا پانی نہ پینا ورنہ بیمار پڑ جاؤ گے...... مجھے اپنی خراب صحت عزیز تھی اس لئے دس فرانک قربان کرنا غنیمت جانا۔ اب فرائڈ رائس خاک مزے کا لگتا۔ کسی طرح زہر مار کیا۔ بس پانی کو بڑے چاؤ سے شمپین کے انداز میں پیا:

''پانی بھی گر پئیں تو مزا ہے شراب کا'' یہ مصرعہ ضرور شاعر نے خریدے ہوئے پانی پر لکھا ہوگا!

جیسے جیسے رات ڈھل رہی تھی راستہ کی رونق بڑھ رہی تھی۔ لوگ اتنے آرام سے ٹہل رہے تھے کہ گھر واپس جانے کا سوال ہی نہیں۔ میں اپنے ہم وطن ہندستانیوں کے بارے میں سوچنے لگا ہم لوگوں کی آدھی زندگی اماؤں کے اس سوال کے جواب میں کٹ جاتی ہے کہ کہاں جا رہے ہو؟ اور بقیہ زندگی بیگم کے سوال میں گزر جاتی ہے کہ کہاں سے آ رہے ہو؟ یہ پیرس ہے یورپ کا دل۔ یہاں کوئی کسی سے کسی طرح کا سوال نہیں کرتا۔ گر کرتا ہے تو کوئی جواب دینے کی زحمت نہیں کرتا۔ ہر کوئی اپنے میں مگن ہر فرد آزاد۔ اچانک ہلکی پھوار پڑنے لگی اور میں ساری رومانیت بھول کر کمرے میں آ گیا اور سو گیا کیوں کہ صبح اٹھ کر بے جماعت نہانا تھا۔ صبح کسی کے دروازہ کھٹکھٹانے پر آنکھ کھلی۔ دیکھا ایک نوجوان نیلا ایپرن باندھے کھڑا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں گڈ مارننگ کہتا اس نے کہا ''بوژو'' اتنا تو سمجھ میں آیا کہ سلامی دی جا رہی ہے۔ پھر اسنے فرنچ میں کچھ کہا۔ میں ابھی آدھی نیند میں تھا۔ کچھ کاف کاف کی طرح تھا۔ میں سمجھا کافی یا بیڈ ٹی کے لئے پوچھ رہا ہے۔ خوش ہو کر میں نے گردن ہلا دی اور کہہ دیا ''وی - وی'' یعنی ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔ وہ دروازے سے ہٹا اور میں دوبارہ لیٹ گیا مگر اچانک کمرے میں کچھ Spray کرنے کی آواز آئی۔ میں جب تک سنبھلتا دیکھا وہی جوان ہاتھ میں اسپرے گن Spray Gun لئے کچھ چھینٹ رہا ہے۔ ہڑبڑا کر میں اردو بولنے لگا۔ بڑی مشکلوں سے وہ رکا۔ وہ مجھے منہ کھولے، میں اسے سر کھجاتے دیکھ رہا تھا۔ میں ہاتھ کے اشارے سے اسے روک کر باہر لپکا۔ مجھے یاد آیا کہ مصیبت کے وقت پانچ منزلہ والے جوڑوں کو یاد کرنا ہے۔ ایک صاحب میری مدد کو آئے۔ سارا ماجرا میں نے انگلش میں کہہ سنایا حضرت ہنسنے لگے۔ میری نیند بغیر نہائے دھوئے پوری طرح غائب ہو چکی تھی۔ پتہ چلا نوجوان صفائی کرنے والا ہے اور پوچھ رہا تھا ''کافِ'' یعنی تل چٹا وغیرہ تو نہیں۔ جسے میں کافی سمجھ بیٹھا۔ خیر نوجوان ''پاغدوں'' یعنی معاف کیجئے گا کہتا ہوا سرک گیا، چلئے اس حادثہ سے چند نئے الفاظ سے آشنائی ہوئی۔ اسے تیزی سے میں نے اردو مین اپنی ڈائری ''گنجینۂ فرنگ'' میں نوٹ کر لیا۔ گھڑی دیکھی صبح کے آٹھ بجا چاہتے تھے۔ صبح آنکھ ہندستان میں کبھی کھلی ہوتی تو پیرس میں کھلتی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ نہانے کے لئے خود کو تیار کیا۔ جب باتھ ہال میں پہنچا تو دیکھا جماعت چھوٹ چکی تھی۔ کچھ میری طرح کے لیٹ لطیف نہانے کی رسم ادا کر رہے تھے۔ میں بھی ان میں جا ملا۔ نہانے میں کیونکہ صرف حرکت اور اشارے کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے زبان کا چکر نہ پڑا۔

۹ بجنے والے تھے، کہر آہستہ آہستہ چھٹ رہی تھی، ہلکی دھوپ پھیل چکی تھی مگر فضا میں کافی خنکی تھی۔ میں گرم لباس اور نرم جیب کے

ساتھ آوارگی کے لئے نکل پڑا۔ ایک چھوٹے سے کیفے میں داخل ہوا۔ ایک سفید براق جیسی معمر خاتون نے مشینی مسکراہٹ کے ساتھ ''بوژو'' کہا۔ میں نے بھی اسی انداز سے بوژو کہا اور ایک کاؤنٹر سے جالگا۔ محترمہ میری فرنچ دانی پر خوش ہوئیں اور لگیں فرفر فرنچ بولنے۔ میں نے اشارے سے انہیں روکا اور کہا' بریڈ، مالٹ، کافی، بڑی بی نے ایک گز بھر لمبی روٹی اور ایک پاکٹ مالٹ تھما دیا ساتھ ہی چھری کانٹا اور مکھن کا پیالہ بڑھا دیا۔ فرنچ روٹی کی بڑی تعریف سنی اور پڑھی تھی مگر گز بھر لمبی اس سخت روٹی کو بطور لاٹھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ سخت کھال کے باوجود روٹی کا دل اندر سے نرم اور مزے دار تھا۔ مالٹ اور فری کے مکھن نے بھی خوب ساتھ دیا اتنے میں بڑی بی نے ایک بہت چھوٹی سی پیالی جسے فنجان کہنا مناسب ہوگا، سیاہ کافی کی میرے آگے رکھ دی۔ میں سامنے بیٹھی ایک فرانسیسی پری وش کا معائنہ کر رہا تھا اور بے خیالی میں پہلا گھونٹ لمبا مار دیا۔ خدا کی پناہ۔ ایسا لگا کریلے کا پانی پی لیا ہو۔ پتہ چلا بغیر دودھ اور چینی کی اصلی فرنچ کافی ہے۔ میں نے عہد کیا کہ اب کافی پیتے ہوئے کسی کو نہ دیکھوں گا اور اگر دیکھوں گا تو کافی نہ پیوں گا۔ تیس فرانک کا بل ادا کر کے میں وہاں سے اٹھا۔ اس عرصہ میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ لوگ واقعی انگلش سے اس طرح پرہیز کرتے ہیں جیسے اچھوتوں کی زبان ہو۔ اول تو جانتے کم ہیں اور جو جانتے ہیں بولنے کے بجائے کندھا اچکا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں مگر ساتھ ہی ٹوٹی پھوٹی بھی فرنچ بولیں تو مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ مجھے دیانا کو فون کر کے اپنے پروگرام سے آگاہ کرنا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک پبلک فون مل گیا۔ دس فرانک کا ایک سکہ ڈال کر نمبر ڈائل کیا مگر انگیج ہونے کی وجہ سے بار بار سکہ واپس آجاتا تھا۔ مجھے اپنے دیسی فون بوتھ یاد آگئے جس میں سکہ ڈال کر شریف شہری یہ گنگنانے پر مجبور ہو جاتا ہے ''جو چلا گیا اسے بھول جا'' اور شہری اگر پہلوان ہے تو ریسیور اکھاڑ کر گھر چل دیتا ہے۔ میں نے آخری بار کوشش کی اور لائن مل گئی۔ مسٹر پال دوسری طرف بات کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی مصروفیت بتائی اور دوسرے دن کا وقت دیا۔ میں نے نقشہ جیب سے نکالا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ نقشہ دیکھ کر سفر کرنا بھی ایک فن ہے۔ میں نقشہ دکھا کر پتہ پوچھتا گھوم رہا تھا۔ آخر ایک پوسٹ آفس ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگیا۔ گھر اپنی خیریت کا تار دیا۔ کچھ ڈاک ٹکٹ خریدے اور کچھ ویو کارڈ خرید کر دوستوں کو روانہ کیا کہ میں واقعی پیرس کی خاک چھان رہا ہوں!

•••



اُردو کُتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

پیرس کل آج اور کل

پیرس اپنے عظیم الشان ماضی اور تابندہ حال کے ساتھ اپنی ثقافت، ادب، قابل دید اور روح پرور مقامات کے لئے دنیا کے تمام شہروں میں عروس البلاد کے نام سے زندہ ہے۔ برسوں سے پیرس مغربی سوسائٹی کو اعلیٰ قسم کی شراب، عمدہ پکوان، نفیس خوشبوجات اور فیشن کی حشر سامانیوں سے مزین کر رہا ہے بلکہ زیب وزینت، فریفتگی وتفریح بھی برآمد کرتا آرہا ہے۔ پیرس کو بجا طور پر فرانس کی راجدھانی ہونے کا فخر حاصل ہے جو دسویں صدی سے اب تک اپنی تاریخی، معاشی اور سیاسی روایات پر قائم ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ پیرس میں کس کا دل کس بات پر آجائے۔ یہ اپنے جیب و ظرف کی بات ہے۔ ویسے میں اب تک اپنے دل سے نبرد آزما تھا۔ پتہ نہیں کمبخت کیا گل کھلائے۔ اہل ہند سمجھتے ہیں کہ یورپ کے ہوائی اڈوں پر اترتے ہی سیاح پری وش مہ رخوں کی جھرمٹ میں کھو جاتا ہے مگر اس وقت تک مجھے کسی پری نے پر نہ مارا تھا (یہ سب ہمارے بزرگوں کے سفرناموں کا کمال تھا) یہ اور بات ہے کہ ان مہ رخوں کے جمال سے رفتہ رفتہ واقف ہو رہا تھا۔ میل ملاپ، محبت فرانسیسیوں میں اس قدر ہے کہ اب وقت اور جگہ کی قید نہیں۔ بوس و کنار پر ٹیکس بھی نہیں اس لئے حسن و عشق کی سرمستیاں عام ہیں۔ بقول شخصے پیرس کی عاشقی بھی سلیقے کی اور فاسقی بھی سلیقے کی۔

مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ فرانسیسی زبان جیسی شستہ وشائستہ ہے نازنینان پیرس بھی ویسی ہی خوبصورت اور شائستہ دکھائی دیتی ہیں۔ اب دلوں کا حال خدا جانے یا پھر وہ جو دل لگائے۔ میں فرنچ کنکشن یعنی ان سے رشتہ کا قائل نہیں اس لئے مزید تفصیل جاننے کی کوشش نہ کی۔ مجھے اخبار پڑھنے کی بیماری نہیں مگر سرخیاں دیکھنا معیوب بھی نہیں سمجھتا۔ ایک بک اسٹال پر سرخیوں کی تلاش میں رک گیا۔ ایک انگریزی اخبار پر نظر پڑی ''انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون'' یہ پیرس کا واحد انگریزی (امریکن) اخبار تھا۔ اس کے علاوہ ٹائم اور نیوز ویک کے شمارے بھی نظر آئے۔ ایک اور دلچسپ اور مفید اخبار تھا ''پیرس کوپ''، جس سے شہر کی تمام تفصیلات اور مصروفیات حاصل کی جاسکتی تھیں۔ ہم کیا دنیا والے بھی پیرس کو ایفل ٹاور اور ایفل ٹاور کو پیرس کی وجہ سے جانتے ہیں۔ پہلی فرصت میں خود کو میں نے ایفل ٹاور دیکھنے کے لئے تیار کیا۔

یہاں کی برق رفتار اور سستی سواری، زمین دوز ریل- میٹرو ہے۔ ٹریفک کی سہولت کے لئے میٹرو بہت کامیاب ہے۔ اسکا ایک کتابچہ نقشے کے ساتھ مل جاتا ہے کہ کون سی ریل کہاں جاتی ہے۔ اسٹیشن پر بھی برقی نقشے بنے ہوئے ہیں آپ کو جہاں جانا ہے اس کا بٹن دبائیں۔ چھوٹی لال پیلی بتیاں جل کر راستہ بتاتی ہیں کہ آپ کون سا رخ اختیار کریں۔ ٹکٹ کی جگہ پیتل کے ٹوکن ہین۔ دس فرانک کے پانچ ٹوکن لے کر میں پلیٹ فارم کے گیٹ پر آیا جہاں دروازے کی مشین میں ایک ٹوکن ڈالتے ہی گیٹ خود بخود کھل گیا اور میں ٹیوب ریل کے انتظار میں پاتال میں کھڑا تھا۔ ریل آئی، کھل جا سم سم، دروازے خود بخود کھلنے لگے۔ میں اس خوبصورت کھلونے نما گاڑی کو دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا کہ دروازے بند ہونے لگے۔ یاد آیا کہ میں اسی گاڑی کے انتظار میں تھا۔ لپک کر داخل ہونا چاہا مگر ہاتھ دروازے سے لگ گئے تھے جو بند ہوتے ہوتے رک گیا اور چند لمحوں میں دوبارہ بند ہونا شروع ہوا۔ اب تک میں سنبھل چکا تھا بڑھ کر سامنے کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دولڑکے میری بوکھلاہٹ پر مسکرا رہے تھے۔ کوئی ایک گھنٹہ کی مسافت کے بعد ہم انوالید کے ایک اسٹیشن پر اترے اور باہر نکلنے والی بھیڑ میں ہو لئے۔ فضا صاف اور سورج کی تمازت میں مزہ آرہا تھا۔ راستہ پر زیادہ بھیڑ نہ تھی۔ دور سے ہی دریائے سین کے ساحل پر ایفل ٹاور جو پیرس کا سمبل بن چکا ہے اپنی عجیب وغریب قد وقامت لئے جلوہ افروز تھا۔ ٹاور کے شمال پر ایک ہرا بھرا پریڈ گراؤنڈ جسے شاں دی مارس کہتے ہیں نظر آیا۔ اس کے جنوب میں ملٹری اکیڈمی کی اٹھارہویں صدی کی محل نما عمارت آج بھی اپنی آن

بان کے ساتھ قائم ہے، یہ وہ عظیم ملٹری اسکول ہے جہاں سے نپولین بونا پارٹ جنگی رموز سے آگاہ ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب نپولین یہاں کی تعلیم سے فارغ ہوا تو اس کے سرٹیفکیٹ پر ایک سنہری ریمارک تھا۔ ''اگر حالات سازگار رہے تو یہ جوان بہت آگے جائے گا۔'' دنیا نے دیکھا کہ واقعی نپولین دی گریٹ نے ہر ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔

ہاں تو ہم گئے تھے ایفل ٹاور دیکھنے مگر آس پاس بھٹک گئے کیونکہ چشمِ کمزور کو ایفل ٹاور اتنا نہیں بھایا جتنا میں نے پڑھ رکھا تھا۔ خیر اس سے اس کی مضبوطی پر اثر نہیں پڑا جس طرح بہت سے سیاحوں کو قطب مینار نہیں جچتا مگر اس سے قطب کی لاٹ پر بھی اثر نہیں پڑتا۔ تکنیک اور ڈھانچے کے اعتبار سے اتنا ضرور ہے کہ یہ عجیب وغریب ہے مگر میں کم از کم اسے خوبصورت نہیں کہہ سکتا۔ اس کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئیں وہ دلچسپ ہیں۔ الکزنڈر ایفل نامی ایک انجینئر نے اسے ۱۸۸۹ء میں پیرس کی ایک عالمی نمائش کے لئے بنایا تھا۔ یہ ٹاور ۹۸۵ فٹ اونچا ہے اور لفٹ کے ذریعہ پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی منزل تک جایا جاسکتا ہے۔ یہ دنیا کا سب سے اونچا ٹاور سمجھا جاتا تھا مگر اب نیویارک کی فلک بوس عمارتیں اور ٹورانٹو۔ کناڈا کا سی این ٹاور اسے شرمندہ کر چکا ہے۔

شام کے چار بج رہے تھے۔ سیاحوں کی خاصی تعداد جمع تھی۔ ٹاور پر جانے کے لئے ایک لمبی قطار بنی تھی۔ میں بھی ان میں جالگا۔ کچھ تھکا ہوا تھا۔ نمبر آتے ہی میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مٹھی بھر ریزگاری کاؤنٹر پر بیٹھی محترمہ کے آگے پھیلا دی۔ چند فرانک لے کر ایک ٹکٹ مجھے بڑھا دیا گیا۔ دوسری جانب ایک بڑے کمرہ نما لفٹ میں لوگ جمع ہو رہے تھے۔ لفٹ سے ہم دوسری منزل پر رکتے ہوئے تیسری منزل پر پہنچے۔ یہ دیکھ کر حیرت اور خوشی دونوں ہوئی کہ اوپر شاندار کیفے اور سجی سجائی دکانیں ہمیں لوٹنے کے لئے تیار تھیں۔

پہلے میں نے کافی لی۔ الگ سے دودھ اور چینی ملائی اور ہلکی ہلکی چسکی لینی شروع کی۔ موسم کی شادابی سمٹ کر کافی کی پیالی میں آگئی تھی۔ تقریباً آٹھ سو فٹ کی بلندی پر ہوا صاف اور شہر کی گھٹن سے پاک تھی۔ اوپر کا ماحول بڑا رومانٹک تھا۔ تھکن کافی اور ماحول سے دور ہو چکی تھی۔ کافی ختم کر کے میں تیسری منزل کی ریلنگ سے جالگا۔ اوپر سے پیرس کی خوبصورت کشادہ راہیں، قدیم محلات اور مخملی پارک بہت بھلے لگ رہے تھے۔ کچھ دور بادل کا ایک آوارہ ٹکڑا منڈلا رہا تھا۔ سامنے دریائے سین پر سورج مچل رہا تھا۔ نیچے سڑک پر گاڑیاں چیونٹی کی طرح رینگ رہی تھیں۔ لگ بھگ چالیس میل تک پیرس اور قرب وجوار کے علاقے نظر کے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسی ماہر مصور نے ایک بہت بڑے کینوس پر بڑی ایمانداری سے رنگوں کو زندگی دے دی ہے۔ تخیل کے پر لگ گئے تھے، میں ایفل ٹاور سے اونچا اڑ رہا تھا۔ طبیعت مچل کر فلک بوسی پر آمادہ تھی۔ پتہ نہیں کب تک ذہنی طور پر اڑا کیا۔ پھر جب جی سنبھلا تو سوچا بطور تبرک چند تصویریں اتار لی جائیں۔ ٹاور سے اترنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا مگر میں اتر آیا۔ میرے ہاتھ میں پیرس گائیڈ بک اور نقشہ تھا۔ کھول کر دیکھا ہزاروں، ہوٹلوں، ریسٹورانوں، بار اور کیفے کے پتے لکھے ہوئے تھے۔ میں نے جیب سے ڈھونڈ کر ایک گم نکالا اور چبانے لگا، کچھ تو کھانا تھا۔ چلئے جب گائیڈ بک دیکھ رہا ہوں تو بتاتا چلوں، پیرس میں ہوٹل اور ریسٹوران چار گروپ میں بٹے ہوئے ہیں۔ مندرجہ ذیل سے ایک وقت کے کھانے کی قیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(۱) گاسترانومی یا الٹرا ڈیلکس: ۳۰۰ سے ۸۰۰ فرانگ یعنی یعنی تقریباً ۵۰۰ سے ۱۰۰۰ روپیہ

(۲) گورمیت یا ڈیلکس۔ ۲۵۰ سے ۵۰۰ فرانک یعنی تقریباً ۴۰۰ سے ۸۰۰ روپیہ

(۳) بس ثروت یا میڈیم: ۲۰۰ سے ۳۵۰ فرانک یعنی تقریباً ۳۰۰ سے ۶۰۰ روپیہ

(۴) ایوریج یا سستا: ۱۰۰ فرانک کے اندر ۱۵۰ روپئے کے اندر

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کا بل ایک وقت کے کھانے میں ہزار روپیہ سے اوپر ہو جائے گا۔ اگر کھانے میں فرانسیسی آتش سیال سے حلق تر کیا جائے اور سوختہ سگار سے کلیجہ گرمایا جائے نیز رخصت کی ٹپ الگ۔ پیرس کے ہر دلعزیز ریسٹوران میں ''میکسم (Maxims)'' کا نام قابل ذکر ہے۔ یہ رورویالے پر واقع ہے۔ یہاں شاہ ایڈورڈ ہفتم کے لئے خاص کرسی ریزرو رہتی تھی۔ حال میں شہزادی مارگریٹ اس کے حسن میں

چار چاند لگاتی آئی ہیں۔ ساتھ ہی یہ دنیا کے امراء و شرفا کا خصوصاً عربی شرفا اور شہزادوں کا پسندیدہ ریستوران و ہوٹل ہے۔ سمجھ میں یہ آیا کہ یہاں کھانے سے زیادہ پبلک ریلیشن پر زور دیا جاتا ہے۔ دوسرا نام ہے ٹاور دی آرنٹ کا جو پیرس کے نعمت کدوں میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ لاگرانڈ، لاویوارس، دی زر، لاسیری وغیرہ وغیرہ۔ بس صاحب اتنے ہی ناموں سے خوب سیر ہوئی۔ میں نے ہوٹلوں پر خاصی ریسرچ کر ڈالی تھی اور اپنی انتھک کوششوں سے ایک اور کلاس کا ریستوران دریافت کر لیا تھا۔ بس اس کا کوئی کلاس ہی نہ تھا اور جسے ڈھابہ کانٹی نینٹل کہہ سکتے ہیں، جو مجھ جیسے منفرد سیاحوں کے لئے وقف تھا۔ کچھ دور بھٹکنے کے بعد مومانتھ کے علاقہ میں میری کیتھرین نامی ایک کیفے میں داخل ہوا ۔ میرا اندازہ ٹھیک تھا کہ وہ واقعی ڈھابہ گریڈ کا تھا۔ بڑے ترنگ میں پنیر سینڈ وِچ اور مچھلی کے قتلوں کا آرڈر دیا اور خوب سیر ہو کر پیٹ کی آگ کو پیپسی کولا کی مدد سے ٹھنڈا کیا۔ کوئی ۴۵ فرانک کا بل ادا کر کے باہر نکلا تو طبیعت ہشاش بشاش تھی۔

جیب میں میٹرو کے دو ٹوکن موجود تھے۔ انہی ٹوکنوں سے بس میں بھی سفر کیا جا سکتا تھا۔ میں نے دیکھ بھال کر بس اسٹینڈ نکالا۔ نقشے کی مدد سے تین سٹاپ بعد ہم بولوا کلیچی پر اتر گئے۔ کچھ فاصلے پر مجھے پیلس ایملی گوڈو جانا تھا۔ یہ مصوروں کی بستی تھی تاکتے جھانکتے ہم وہاں پہنچ ہی گئے۔ مصوری کے اعلیٰ نمونے بکھرے پڑے تھے۔ پتہ چلا کہ یہی وہ وادی ہے ہمدم جہاں پکاسو جی رہتے تھے۔ جی ہاں! میں مکان نمبر ۱۳/ر کے سامنے کھڑا تھا جہاں پکاسو نے اپنی مصوری کے لافانی شاہکاروں کو جنم دیا۔ یہ مکان اب ایک آرٹ گیلری میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اب پکاسو کہاں دفن ہے میں پوچھنا بھول گیا۔

میں نے پکاسو کی روح کو خراج عقیدت پیش کرنے کے چکر میں جی کڑا کر کے چندو یو کا رڈ اور دو ایک تصویریں خرید لیں اور یہ سوچ کر خوش ہو گیا کہ میں نے آرٹ کی قدر کرنا سیکھ لیا۔ چلو پیرس نے کچھ تو سکھایا کیونکہ ابھی اور بہت کچھ سیکھنا باقی تھا۔ میں نے وہاں سے کوچ کیا۔ اندھیرا ابھی پوری طرح نہیں پھیلا تھا میں نے لور مومانتھ کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ جب تک میں وہاں پہنچا، اندھیرا پھیل چکا تھا اور سارا علاقہ جگمگ جگمگ کرتے قمقموں سے چمک رہا تھا۔ گویا کلکتے کا درگا پوجا کا سا ماحول تھا۔ لوگ جوق در جوق زرق برق لباس میں گھوم رہے تھے۔ آگے بڑھے تو دیکھا درگا کی مورتی کی جگہ ایک بہت بڑی پن چکی بقعۂ نور بنی ہوئی ہے۔ بڑے ناز و انداز سے اس کے پنکھے ہولے ہولے گھوم رہے تھے۔ یہ سلطان عالم اختر پیا کے اندر سبھا جیسا ناچ گھر ''مولن روج'' تھا۔ اس کی شہرت اتنی بڑھ چکی ہے کہ اب اس پر ایک فلم زیر تکمیل ہے۔ خوش رنگ، خوش وضع سیاحوں کی عید تھی۔ کہا جاتا ہے کہ رینائر اور ٹولوس لاٹرک جیسے مشاہیر فن Renoir and Toulouse Lautrec یہاں روانہ خوش فعلیوں کے لئے حاضری دیتے تھے۔ خصوصاً ٹولوس لاٹرک نے خوش ہو کر یہاں کی رقاصاؤں اور ان شرفاء اور رؤسا کی جو اس محفل کے روح رواں ہوتے تھے قد آدم تصویریں بڑی صفائی اور لگن سے بنا کر پیش کی ہیں جو مولن روج میں آویزاں ہیں۔ پیرس کے شائستہ نائٹ کلبوں میں اس کا نام سر فہرست ہے۔ ہمیں شائستگی تو نظر نہ آئی ہاں وارفتگی ضرور نظر آئی۔ اس کلب کا روایتی کین کین ناچ اہل ذوق کے لئے تریاق سے کم نہیں مگر بھارت ناٹیم کی بات ہی کچھ اور ہے۔ کچھ ہی فاصلے پر پیلس پگالے کا علاقہ تھا۔ یہاں جتنے شبینہ کلب دکھائی دیئے شاید ساری دنیا میں نہ ہوں۔ یہ عیش کوشی بنام تفریح کی سب سے بڑی منڈی تھی۔ عریانیت کی بڑی فراخدلی سے عام نمائش تھی اور فرنچ اسے معیوب نہیں سمجھتے۔ ہائے کاش ہم لوگ بھی فرنچ ہوتے۔ سامنے کیفے پگالے میں پناہ لی اور سیاہ کافی جو مقدر میں لکھی تھی اسکی چسکی میں عافیت سمجھی اور مشرقیت کا آموختہ ذہن میں دہرایا گیا۔ ابھی کافی ختم نہیں ہوئی تھی کہ مجھے یاد آیا مس دیانا نے ڈنر پر بلایا تھا۔ گھڑی دیکھی رات کے دس بجا چاہتے تھے۔ فون کیا پتہ چلا کہ بے چارے میرے منتظر ہیں۔ میں نے فوراً ٹیکسی لی اور شاہراہ گیسری بالڈی کے لئے کہا۔

کوئی دس منٹ میں ہم دیانا کے دروازے پر کال بیل بجا رہے تھے۔ دروازہ کھلا پہلے ایک بڑی سی بھوری بلی پھر پال اور پیچھے مس دیانا یا نمودار ہوئیں۔ دونوں نے ہیلو کہتے ہوئے سیدھے کھانے کی میز پر آنے کو کہا۔ میں نے بیٹھتے ہی معذرت کی اور بتایا کہ میں راستہ بھول گیا تھا۔ اب یہ کیسے کہتا کہ فرنچ مجرا دیکھ رہا تھا۔ میرے لئے خاص طور پر سبزی کی ڈش تیار کی گئی تھی۔ ایک بات قابل ذکر ہے کہ دیانا اور پال دونوں گوشت خور نہیں

اور نہ ہی شراب نوشی کرتے تھے۔ ویسے آج کل مغرب کا عام رجحان ویجیٹیرین ہوتا جا رہا ہے مگر پیرس میں رہنے والوں کے لئے شراب نہ پینا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ یہاں شراب سستی اور پانی مہنگا ہے۔ میرے سامنے گاجر، مولی، ٹماٹر، سلاد، آلو، سویا بین، چنے اور دیگر ترکاریاں بڑے قرینے سے سجی ہوئی تھیں۔ ابلی ہوئی ترکاریوں پر فرنچ ڈریسنگ اور Thousand Island نام کا روغن۔ ساتھ ہی زیتون کے تیل کا چھڑکاؤ کر کے کام و دہن کو لذت بخشی گئی۔ ساتھ ہی دو تین طرح کے پنیر اور فرنچ رول بریڈ۔ کھانے کی پوری میز بڑی خوبصورت تھی مگر مزہ سمجھانے سے قاصر ہوں کیونکہ میں زیادہ تر قریب کے انگور، شفتالو اور دیگر پھلوں پر دھیان دے رہا تھا۔ دراصل ان تمام لوازمات کے باوجود ذہن اسے کھانا قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ بھئی کھانا تو ہم ایک چپاتی، تھوڑی سی دال، ایک پیالہ سالن اور کچھ چاول اور تھوڑی سی چٹنی کو کہتے ہیں۔ اسے چاہے میز پر کھاؤ یا چٹائی پر اس میں جو مزہ ہے وہ کسی اور ڈش میں کہاں۔ کھانے کے بعد فرمائش پر مجھے دودھ والی چائے پیش کی گئی۔ فرانس میں چائے ہر شخص نہیں پیتا بالکل اسی طرح جیسے ہمارے یہاں ہر کسی کو شراب نصیب نہیں خاص موقع پر یہاں مہمانوں کو چائے پیش کی جاتی ہے وہ بھی بغیر دودھ اور چینی والی۔ جس طرح ہمارے یہاں بڑے لوگوں کی پارٹیوں میں خاص مہمانوں کو ولایتی شراب بغیر سوڈا اور برف کے پیش کی جاتی ہے۔

ڈنر کے بعد کچھ دیر گپ شپ ہوئی، کچھ ہندستانی کلچر کا ذکر اور دوسرے دن پیرس کے عجائب خانوں کی سیر کا پروگرام بنا۔ مسٹر پال اپنی گاڑی سے مجھے ہوسٹل تک چھوڑنے آئے۔ رات کے سوا بارہ بج رہے تھے۔ ہوسٹل میں خاموشی تھی مگر باہر کافی چہل پہل تھی۔ کمرے میں آ کر میں کچھ دیر تک کھڑکی سے لگا نیچے کا منظر دیکھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ رات گئے تک فرنچ راستوں پر بھٹکتے ہیں، کلبوں میں ناچتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں اور کیا کچھ نہیں کرتے مگر صبح آٹھ بجے کیسے چاق و چوبند دھندے پر جاتے ہیں۔ یہ لوگ اگر سوتے ہیں تو کتنی دیر؟ مجھے کیا! کچھ خطوط لکھنے تھے، دن بھر کی رپورٹ الٹی سیدھی قلم بند کی اور نرم ٹھنڈے بستر پر دراز ہو گیا۔

●●●

http://www.kitaabghar.com



اُردو کُتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

دنیا کا سب سے بڑا عجائب خانہ پیرس

گھڑی نے صبح کے دس بجائے، میں نے لباس تبدیل کیا اور نیچے اتر رہا تھا کہ پال مجھے لینے آ گئے۔ اتوار کا دن تھا۔ آج پال اور دیآنا کو فرصت تھی اور مجھے پیرس کے عجائب خانوں کی سیر کرنی تھی۔ باہر گاڑی میں دیآنا میری منتظر تھی۔ میں نے بڑھ کر بوژو کہا۔ دونوں خوش ہو گئے کہ میں فرنچ میں بہت جلد ترقی کر رہا تھا حالانکہ میرے پاس فرنچ کے صرف گنتی کے الفاظ تھے۔ خیر گاڑی راستہ پر پھسلنے لگی۔ پیرس کی کشادہ، صاف اور خوبصورت شاہراہوں کو دیکھ کر کلکتہ کے پہاڑی زیریز بر راستے اور گنجان آبادی کی جس ذہن کے پردے پر مچل اٹھی۔ مجھے کھویا ہوا دیکھ کر دیآنا نے سکوت توڑا اور پیرس کے بارے میں میرے تاثرات جاننا چاہا۔ میں نے جواب میں اپنے کوٹ کے کالر پر لگا ہوا بروچ دکھایا جس پر لکھا تھا: ''آئی لو پاری I Love Paris.''۔

فرنچ پیرس کو پاری کہتے ہیں۔ یہ یہاں کے تلفظ کا کمال ہے۔ وہ لکھتے تو بہت کچھ ہیں مگر بولتے وقت آخیر کے بہت سے حروف ہضم کر جاتے ہیں۔ اگر سیاح اس بات کا خیال رکھے تو اچھی خاصی فرنچ بول سکتا ہے جس طرح ہمارے اہلِ زبان ش-ق کا خیال رکھتے ہیں اسی طرح فرنچ بھی بہت ژیں، زاں اور غوں غاں کرتے ہیں۔

ہاں تو دیآنا نے بتانا شروع کیا کہ پیرس کی خوشبو اور شراب کے علاوہ محلوں، پارکوں، شاہراہوں، پلوں اور عجائب خانوں کا شہر ہے۔ میں نے لقمہ دیا کہ پیرس دنیا کا سب سے بڑا عجائب خانہ ہے۔ خیر میں نے سنجیدگی سے سننا شروع کیا۔ کسی دانشمندی نے مجھ سے کہا کہ کسی کے دل میں اپنی دکان جمانی ہو تو اپنی زبان سے زیادہ کانوں کا استعمال کرو۔ میرے آج اور کل میں بڑا فرق ہے۔ آج ہم ایک شائستہ وحسین گائیڈ کے ساتھ ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں رواں دواں ہیں۔ کل اکیلے دھوپ میں بھٹک رہے تھے اور گنگناتے تھے ع پھرتے ہیں میر خوار کوئی دیکھتا نہیں تو ہم بات کر رہے تھے پیرس کے عجائب خانوں کی۔ پتہ چلا کہ جناب پیرس میں صرف ۲۲ عجائب خانے اپنے منفرد اور قدیم اثاثے کے لئے مشہور ہیں جن میں میوز وکٹر ہیوگو، روڈن، نی سی ڈی کوما نڈو، مونومنٹ فراسیا، گریون، ڈی کلانی، بس بس ہم نے روکا اور دریافت کیا کہ ان تمام انمول عجائب گھروں میں سب سے بہتر کون ہے۔ دیآنا نے میری قدردانی پر مسکراتے ہوئے بتایا کہ میوزی دی لوور۔

مسٹر پال نے گاڑی کا رخ The Lovure کی طرف کیا۔ گاڑی میں لگا ہوا ٹیپ میری پروا کئے بغیر فرنچ میں کچھ گائے جا رہا تھا۔ ہم لوگ ہینس دیلس وسجیس سے گزر رہے تھے۔ بہت ہی رومان پرور علاقہ تھا اور خاصیت یہ تھی کہ ہر مکان قد و قامت، رنگ اور نقاشی میں بالکل یکساں تھا جیسے پنک سٹی جے پور۔ معلوم ہوا کہ ہنری چہارم نے ۱۶۰۵ء میں یہاں قیام کیا تھا اور اس کے حکم سے ایسی یکسانیت تھی۔ یہ علاقہ یوں بھی مشہور ہے کہ ادیبوں کا مرکز تھا جن میں گاٹیئر، ڈاؤدیت اور وکٹر ہیگو معروف ہیں۔ وکٹر ہیگو جو مکان نمبر ۶ میں رہتا تھا اب میوزیم میں تبدیل ہو گیا ہے۔

گاڑی سبک رفتاری سے بڑھ رہی تھی۔ پال نے بتایا کہ سامنے پیرس کا سب سے قدیم اور سب سے بڑا قبرستان پیرے لاچیز

سمیٹری ہے یہاں اوسکر وائلڈ اور مولیئر کا مقبرہ ہے۔ تقریباً چالیس منٹ چکر لگانے کے بعد گاڑی پیلس ڈی لوور پر مڑی۔ سامنے میلوں پھیلا ہوا یہ عجائب گھر نظر آیا۔ ہم لوگ گاری سے اترے۔ دھوپ چمک رہی تھی۔ دیانا نے ایک ماہر گائیڈ کی طرح بتانا شروع کیا۔ دی لُوور دنیا کا سب سے بڑا اعجائب خانہ ہے بلکہ دنیا کے عالیشان محلوں میں سے ایک ہے۔ یہ سولہویں صدی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ سب سے پہلے فرانکوائیس اول، اس کے بعد ہنری دوم کی بیوی کیتھرین میڈیسی، پھر لوئی چہارم اور آخر میں نپولین اول سے لے کر سوم تک کا یہ محل رہ چکا ہے۔ اس میں قدیم صنعت وحرفت کا ایک بیش قیمت خزانہ موجود ہے۔ جو تاریخ اور آرٹ کے طالب علموں کے لئے انمول سرمایہ ہے۔ میوزیم دی لوور چھ خاص شعبوں میں بٹا ہوا ہے۔ ہر شعبہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان چھ شعبوں میں یونانی، رومن، مصری اور مشرقی دبستان کے قدیم علوم وفنون جو آٹھویں صدری سے لے کر پندرہویں صدی تک کے عرصے کے درمیانی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں موجود ہیں۔ ساتھ ہی مصوری اور سنگ تراشی کے نادر نمونے بکھرے پڑے ہیں۔ اندازہ یہ ہوا کہ سرسری طور پر بھی پورے عجائب خانہ کو دیکھا جائے تو ہفتہ بھر سے زیادہ لگ جائے گا اور اگر لکھنے والا دم خم رکھتا ہے تو صرف میوزیم لوور پر ایک ضخیم کتاب تیار کی جاسکتی ہے۔ دائیں ہاتھ پر ہی ایک بڑا سا ہال مصوری کے نوادرات سے پُر تھا۔

یہ سمجھتے ہوئے کہ میں آرٹ کا دلدادہ ہوں اور کہیں کچھ نہ رہ جائے۔ دیانا اور پاؔل باری باری بڑی تفصیل سے ہر مصور کی کارکردگی بتارہے تھے۔ سامنے مائیکل انجیلو کا ایک قد آدم شاہکار ''غلام'' The Slave کے سامنے بھیڑ لگی تھی۔ مصور نے غلاموں کی حالت زار کی عکاسی کی تھی۔ میرے دل پر بھلا یہ منظر کیا اثر کرتا۔ ہمارے یہاں غلاموں کی حالت آج بھی ابتر ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ Slave کی جگہ Lalour نے لے لی ہے۔ جس ہال میں ہم کھڑے تھے وہاں نہ صرف دیواروں بلکہ چھت اور گنبد کے اندر بھی مصوری کے نمونے بنے ہوئے تھے۔ یہ ہال صرف مائیکل انجیلو کی عکاسی کا تھا۔ ایک عکس جسے ساری خلقت گھور رہی تھی۔ Creation of Adam تھا جو مجھے پسند آیا۔ ایک اور تصویر قلوپطرہ کی اچھی تھی۔ پاس کے ہال میں ایک عکس کو سب بڑے اشتیاق سے دیکھ رہے تھے۔ یہ حضرت ابلیس کی تصویر تھی۔ اس کا خالق پیٹر پال روبن تھا۔ ایک اور تصویر ایک بچے کی تھی جو بانسری بجا رہا تھا۔ یہ ایڈورڈ مانت Edward Mount کی بنائی ہوئی تھی۔ ایک اور اچھی تصویر ریم براںڈت Rembrant کی میوزیکل پارٹی تھی۔ کچھ اور شاہکار جین بولون اور فرانز ہالس کے تھے جن میں ہالس کا زندہ دل خانہ بدوش لڑکی کا عکس خوب تھا۔ اس کے آگے کی گیلری میں مصور مارک شگال M.chagall کی مصوری ''تنہائی'' اور ''وائلنسٹ'' پر لوگ سر دھن رہے تھے۔ اس سے پرے پال گاگن کے تین کتے کے پلے تھے۔ آگستے رینائر Auguste Reniir کا شاہکار Grand Palais دلکش تھا۔ پھر ایڈگر دگاس Edger Degas نے بیلے Ballet کا منظر نامہ پیش کیا تھا۔ کچھ فاصلے پر ٹولوس لاٹرک کے نمونے تھے۔ ڈیوڈ لوئیس نے جنگ کی منظر کشی کی تھی۔ کچھ آگے بڑھے تو ایک گیلری پکاسو Aublo Picasso کی تھی جس کی چند عکاسی جدید آرٹ کا آئینہ تھی۔ میں نے بڑے فکر سے دیاؔنا کو بتایا کہ میرے یہاں بھی ایک بانکا مصور ہے مقبول فدا حسین۔ اس کی کاٹ چھانٹ پکاسو سے کسی طرح کم نہیں۔ جان لو کہ ہندستان بھانت بھانت کے کلاکاروں کا دلیس ہے یہ اور بات ہے کہ اکثر Processing ہی میں غروب ہو جاتے ہیں۔ ہم نے محسوس کیا کہ کچھ تھکن سی ہوگئی تھی۔ تمام آرٹ گیلریاں میلوں لانبی محسوس ہو رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں آنکھیں جلنے لگیں۔ آخری سرے پر فرنچ مصور یوسن لورین، ڈیلاٹور، فراگورڈ وغیرہ کی تصویریں توجہ کا مرکز بنیں۔ ان پر اتنا سنا کہ کچھ یاد نہیں۔ ہاں ایک بات یاد آئی کہ ۱۸۳۵ء یا ۱۸۴۱ کے درمیان فرنچ مصوروں میں سپارو، مونٹ، رینائر، ڈیگاس کے نام قابل ذکر ہیں۔ اتنا کچھ دیکھنے اور تھکنے کے باوجود ذہن و نگاہ کسی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میں نے خود کو بہلایا کہ میاں تمہاری نظر تو ہمیشہ کسی کو ڈھونڈا کرے ہے۔ بڑے دیدہ ور ہو!

باٹا کے نئے جوتے نے آج ہفتہ بھر بعد بدلہ لینا شروع کیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں کاٹے جارہا تھا۔ میں تقریباً لنگڑا کر چل رہا تھا۔

حال تو خراب تھا ہی چال بھی بگڑ گئی۔ ہم واپسی کے لئے دوسری گیلری سے جلدی جلدی گزرنا چاہ رہے تھے کہ ایک کنارے اطالوی استاد لیونارڈی ونچی Leonardo De Vinci کے لافانی شاہکار ''مونالیسا' Mona Lisa کے قد آدم عکس نے ہمیں رکنے پر مجبور کردیا۔ ایک بھیڑ اسے دیکھے جارہی تھی۔ مونا لیسا کی مسکراہٹ دنیا کے لئے معمہ ہے مگر فی الوقت مجھے محسوس ہوا کہ محترمہ میرے جوتے کے کاٹے ہوئے کی بے چینی پر مسکرارہی ہیں۔ اتنا آسان نہین کسی راز کو پالینا۔ جس کا جوتا کٹورا ہوتا ہے وہ جانتا ہے۔ اس جاودانی مسکراہٹ نے بیساکھی کا کام کیا۔ ہم کچھ اور برداشت کرنے کو تیار ہوگئے۔ سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر آئے بلکہ لائے گئے ۔ یہاں یونانی اور رومن بت ہمارے استقبال کو کھڑے تھے۔ سامنے وینس کی خوبصورت مورتی جسے وینس ڈی میلا کہتے ہیں، کٹے ہوئے بازوؤں کے ساتھ میری پریشانی میں شریک نظر آئی۔ یونانی فن کاری کے ہم پہلے ہی معتقد تھے۔ چلو اب دیکھ بھی لیا۔ یونانی یزداں صف بستہ ایستادہ تھے اور پانچوں صدی عیسوی کا ماحول تازہ کئے ہوئے تھے۔ میں نے پآل اور دیآنا سے کہا کہ آپ لوگ جو کچھ مجھے دکھا رہے ہیں میں رات گئے تک اسے سیاہ وسفید کرتا ہوں۔ اگر مجھے اب ایک انچ بھی چلنے کو کہا یا ذرہ برابر بھی کچھ دکھایا تو میں آج کی تاریخ میں کچھ نہ کچھ لکھ سکوں گا۔ لہٰذا کوچ کیا جائے۔ انہوں نے شرافت سے گردن ہلائی اور ہم تمام یونانی یزداں اور مصور بھائیوں کو خدا حافظ کہتے باہر کی ہوا کھانے نکلے۔ ہم لوگ عجائب خانہ کے پیچھے سے گاڑی لے کر نکل رہے تھے کہ سامنے ایک عظیم الشان رومن وضع کی محراب نظر آئی جسے ''فتح محراب'' کہتے ہیں۔ پتہ چلا کہ نپولین صاحب نے ۱۸۰۵ء کی فتوحات کے جشن کے سلسلے مین تعمیر کرایا تھا۔ کانوں میں بگل، نفیری اور فوجی بوٹوں کی بازگشت گونج اٹھی۔ اس کے دائیں بائیں خوبصورت ہرا بھرا باغ تھا۔ اس کے بعد شاہراہ کان کارڈ کا سلسلہ تھا۔

●●●

http://www.kitaabghar.com



اردو کتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

ہوٹل فخرِ ہندوستان

دن بھر عجائب خانے کی خاک پھانکنے کے بعد تھکن تو تھی ہی بھوک بھی خوب چمک گئی تھی۔ میرے میزبان اور گائیڈ نما ساتھی صبح سے میرے لئے سرگرداں تھے۔ میں نے انہیں ہندستانی کھانا کھانے کی دعوت دے ڈالی۔ بہت ہاں، نا کے بعد میں نے انہیں آمادہ کرلیا۔ مجھے یاد تھا کہ میرے ہوسٹل کے قریب ہی ''انڈین پرائڈ'' (Indian Pride) نامی ایک دیسی ریستوراں پر اکثر میری نظر رکی تھی۔ بس میں نے پتہ بتایا۔ کوئی بیس منٹ کی دوڑ کے بعد ہم لوگ رودی تریویس کی گلی میں داخل ہو رہے تھے۔ گاڑی ریستوراں کے سامنے رکی، باہر سے یہ کوئی بہت شاندار نعمت کدہ نہ تھا مگر ہم نے جذبہ حُب الوطنی سے سرشار ہوکر اندر قدم رکھا۔ گیٹ پر جاپانی قمچیاں سی آویزاں تھی۔ وہ جلترنگ کی طرح بج اٹھی جس سے مراد میزبان کو مطلع کرنا تھا کہ شکار جال میں آ گیا۔ میری چھٹی حس نے مجھ سے کہا کہ گھنٹی خطرے کی لگتی ہے۔ جب تک ہم کچھ سوچتے کالے سوٹ میں ملبوس ایک پکے عمر کے سانولے صاحب نے ویل کم اور ساتھ ہی ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔ ہم نے ایک کونے کی میز کو چنا۔ اندر زیادہ لوگ نہ تھے۔ ہلکی نیلی روشنی تھی اور مدھم سروں میں آنند شنکر کا ریکارڈ بج رہا تھا۔ دیوار پر باٹک پرنٹ کی چادر کو بطور ہندستانی آرٹ استعمال کیا گیا تھا۔ ایک طرف نٹراج کی مورت ناچ رہی تھی۔ میز اور کرسیاں بید کی تھیں۔ پورے ہال میں صندل کی اگربتی مہہ مہہ کر رہی تھی یعنی ماحول پورا مشرقی تھا۔ کچھ دیر کے لئے ہمیں یہ سب بہت اچھا لگا۔ پتہ نہیں یہ گھر سے دوری یا آنند شنکر کی مشرقی و مغربی ملی جلی موسیقی کا اثر تھا۔ معلوم ہوا کوئی اہل مدارس ہندستانی پکوان کو عام کرنے کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ اتنے میں ایک سانولی بچی سلونی مسکراہٹ لئے بنگلوری ساری میں ملبوس آرڈر لینے آدھمکی۔ میں مینو پر اور محترمہ مجھ پر جھکی پڑتی تھیں۔ جیسے جیسے نظر مینو پر پکوانوں اور ان کی قیمتوں پر پھسل رہی تھی میرا پارہ چڑھ رہا تھا۔ غضب خدا کا۔ مینو نے پاؤ بھر خون خشک کر دیا تھا۔ ایک نان بیس روپے، بریانی کی پلیٹ ایک سو بیس روپے۔ ایک قلیہ قورمہ اسی روپے، ایک سیخ کباب ۸۰ روپے، رائتہ کی پلیٹ چالیس روپے، مچھلی کے قتلے چالیس روپے، گاجر کا حلوہ پچاس روپے، آگے پڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ آنند شنکر کی موسیقی اب بور کر رہی تھی۔ کاش میں بھاگ سکتا۔ میرے پاؤں میں مروت اور تکلف کی بیڑی پڑی تھی۔ دل کی ڈھارس بندھانے کے لئے ہم نے سوچا یہ لوگ ہمیں اتنا وقت دے رہے ہیں، ان کی گاڑی میں ہم گھوم رہے ہیں۔ ایک دفعہ تو قربان ہو ہی جاؤ۔ بھائی جاوید، ایسی بھی کیا کفایت شعاری۔ میں نے فوراً موڈ بدلا اور گلا صاف کرتے ہوئے آرڈر دیا۔ ٹھیک ہے مادام تین بریانی لے آیئے۔ انہوں نے پوچھا اور — میں نے کہا ساتھ میں سیب کا رس لے آیئے، انہوں نے پھر پوچھا اور میں نے کہا اور، اچھا کچھ رائتہ بھی لے آیئے، مادام نے پھر بڑی ادا سے کہا، سر بریانی کے ساتھ سالن کیا لاؤں'' میں نے حیرت سے انہیں دیکھا اور پوچھا کہ بریانی آپ کس بلا کو کہتی ہیں۔ ہمارے یہاں بریانی کے ساتھ سالن نہیں کھاتے اور سالن کے ساتھ بریانی نہیں۔ روٹی توڑتے ہیں۔ انہوں نے مزید مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ ہندستان نہیں۔ یہاں تو بریانی کے ساتھ قلیہ قورمہ یا اسٹو بھی لینا پڑتا ہے۔ ارے ظالم سانولی حسینہ! ہندستان نہیں مگر ہندستانی پکوان تو ہے (اگر ہندستان ہوتا تو

بخدا ہم آپ کا قورمہ بنا دیتے) یہ تمام گفتگو میں بڑے صبر کے ساتھ ہندی میں کر رہا تھا کہ میرے مہمان نہ سمجھ پائیں۔ میری لمبی گفتگو سن کر پال پوچھ بیٹھے کہ معاملہ کیا ہے؟ میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا کہ کچھ نہیں۔ بس عرصہ دراز بعد ہم لوگ ملے ہیں ذرا گاؤں کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اتنے میں

ہوٹل کے مالک جنہوں نے ہمارا استقبال کیا تھا، محترمہ کی مدد کو آ پہنچے۔ پتہ چلا کہ جناب محترمہ کے والد ہیں۔ یعنی پورا خاندان مل کر لوٹ رہا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ مجبوراً بریانی کے ساتھ قورمہ تو کیا کھاتا سیخ کباب کا بھی آرڈر دیا۔ خیر مزید لن ترانی نہ ہوئی اور مادام سیب کا رس سامنے لگا کر چلتی بنیں۔ میرا موڈ بہت خراب ہوا مگر مہمانوں کو ظاہر نہ کیا اور جب تک کھانا آتا میں بریانی، رائتہ اور سیخ کباب کی ہیئت، مزہ تاریخی پہلو اور دیگر معلومات پر اپنے ساتھیوں کو لکچر دیتا رہا۔ مسٹر پال حیران تھے کہ ہندستانی اتنی مرغن غذائیں روز کیسے کھاتے ہیں۔ دل میں آیا کہ بتا دیں کہ عام ہندستانی غم کھاتا اور آنسو پی کر گزارا کرتا ہے۔ وہیں یہ مغلیہ ڈشیں، دراصل یہ ہمیں کھا رہی ہیں ہم بھلا انہیں کیسے کھا سکتے ہیں۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کھانا آ گیا۔ سیخ کباب پتہ نہیں کیسے اچھا تھا، رائتہ گوارہ کر سکتے تھے مگر خدارا بریانی سب کچھ تھی مگر بریانی نہ تھی، ہوتی بھی کیسے؟ جس طرح لکھنؤ کا باورچی مسالہ ڈوسا یا اڈلی تیار کر پائے گا بس ویسی ہی بریانی مدارس کے کسی برہمن باورچی نے بنائی تھی۔ میں لٹ جانے کے باوجود خوش تھا کہ میرے مہمان اس دعوت سے خوش تھے۔ تقریباً آٹھ سو کچھ روپئے کا بل مع پندرہ فیصد سروس چارج کے ادا کر کے اٹھا تو مادام ہوسٹس نے بغیر ٹیکس کی مسکراہٹ کے ساتھ 'مرسی بکو' یعنی شکریہ کہا۔ میں نے سوچا چلتے چلتے انہیں کہہ دوں کہ مادام جتنا انصاف آپ مسکرانے کے ساتھ کر رہی ہیں کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ انصاف بریانی کے ساتھ بھی کیا جاتا۔ واقعی غیر ہندستانی ریستورانوں پر ہمیں فخر ہے۔ میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہی اپنی ڈائری میں آئندہ نسل کے لئے ایک وصیت ٹھونکی کہ اگر وہ بھی بھول سے پیرس آ جائیں تو کم از کم ریستوران فخرِ ہندستان میں داخل ہونے کا دھوکہ نہ کھائیں۔ میں نے اپنی ڈائری بند کرتے ہوئے بڑا سکون محسوس کیا۔

دیانا نے دن بھر کی گردش کا ذکر چھیڑ دیا اور کہا کہ جاوید شاید تم تھک گئے ہو اور میرے خیال میں پیرس کے عجائب خانوں نے تمہیں متاثر نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ میں تھکا ضرور ہوں کیوں کہ جوتے نے دن بھر قدم بوسی کی ہے مگر آپ کے عجائب خانوں نے میری جانکاری میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے اور خوب لطف اندوز بھی ہوا ہوں۔ ہاں ایک بات کا افسوس ضرور ہے کہ کاش میں اسے دیکھنے کیلئے ننگے پاؤں امریکن ٹورسٹ کی طرح آ جاتا۔ اچانک پال پوچھ بیٹھے کہ تمہارے کلکتے میں کتنے عجائب خانے ہیں۔ میں نے کہا ظاہر ہے پیرس کی طرح بائیس تو نہیں مگر ایک بہت بڑا نیشنل میوزیم ہے جسے جادو گھر کہتے ہیں اور دو ایک اور ہیں جیسے نہرو میوزیم اور برلا ٹکنولوجیکل میوزیم وغیرہ۔ ویسے پورا کلکتہ عجیب و غریب ہے۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم لوگ آرٹ کے دلدادہ نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ آپ کی آرٹسٹک اشیاء عجائب خانوں کی زینت بن چکی ہیں جب کہ ہمارے ہموطن اتنے قدرداں ہیں کہ پرانی سے پرانی ٹوٹی پھوٹی چیزیں سینے سے لگائے رہتے ہیں۔ خود ہمارا گھر ایک عجائب گھر ہے۔ آپ جب کلکتہ تشریف لائیں تو میں آپ کو دکھاؤں کہ میری والدہ ماجدہ کے پاس میری دادی مرحومہ کے والد کے زمانے کا پاندان و خاصدان موجود ہے۔

اسکے علاوہ پرانے ٹرنک، دیگچی، مرتبان اور لوٹے وغیرہ غدر کے وقت کے موجود ہیں۔ جنہیں میرے دادا خلد آشیاں اپنے آبائی وطن لکھنؤ جنت نظیر سے ہجرت کرتے وقت ساتھ لائے تھے۔ ہمارا چھوٹا بھائی گو تاریخ کا طالب علم نہیں مگر اسکے پاس شاہ عالم ثانی کے سکے اور امپیریل برٹش سرکار کے ڈاک ٹکٹ اور شاہانِ اودھ کے دربار کے قلمی نسخے جیسے 'علاجِ کبوتراں' وغیرہ وغیرہ بڑی حفاظت سے رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے یہ سب انفارمیشن بڑی سنجیدگی سے عطا کی۔ دیانا اور پال نے اسے بڑی حیرت و حسرت سے سنا اور رشک سے مجھے دیکھا کئے!

●●●

کوچۂ شاں مشال کی مست خرامیاں

نوتری ڈیم کا گرجا پیرس کی تاریخی اور سب سے اعلیٰ ومقدس عبادت گاہ ہے۔اس کا سنگِ بنیاد ۱۱۶۳ء میں رکھا گیا تھا اور یہ ۱۳۰۰ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔یہ اس دور کی سنجیدہ عیسائیت کی لہر کا ثمرہ ہے۔اس کے بنانے میں شہر کے خاص وعام،ماہر سنگ تراش،اعلیٰ قسم کے معمار،تجار اور مذہبی رہنما پیش پیش تھے۔دو بلند وبالا سیدھے میناروں کے ساتھ نوکیلے محرابوں اور آدھے حیوانوں اور آدھے انسانی مجسموں،رنگین منقش دریچوں،مخروطی چھتوں اور لانبے ستونوں کی سج دھج دیکھئے تو بس دیکھتے رہ جائیے۔اسے گوتھک آرکی ٹکچر (Gethic Architeture) کہتے ہیں۔گرجا تقریباً ۱۱۵/رفٹ اونچا ہے۔عبادت گاہ کے اندر تقریباً ۹۰۰۰/افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے اور خاص تقریبات جیسے کرسمس یا جشن آزادی کے روز ایک اندازے کے مطابق ۱۳۰۰۰/افراد شرکت کرتے ہیں۔گرجا کے صحن میں کنواری مریم نوزائیدہ یسوع کے ساتھ پاکیزگی کی تصویر بنی کھڑی ہے۔

پرانے طرز کے در ودیوار پر ایک گمبھیر خاموشی مسلط تھی۔ہم نے دو باتیں نوٹ کیں۔پہلی یہ کہ چودھویں صدی کی اعلیٰ کاریگری کے باوجود کوئی بھی چیز یکسانیت نہیں رکھتی تھی۔یہاں تک کہ دونوں بلند میناروں کے سائز میں بھی کچھ فرق تھا۔دیگر در ودیوار کے نقشوں میں بھی تضاد تھا۔دوسری بات یہ تھی کہ اس کی زیبائش وپیائش اس کی رفعت ووسعت کے باوجود ہر سو ایک عجیب سادگی تھی جو دل پر نقش کر گئی۔

میں نے بڑی تفصیل سے پورے گرجے کا معائنہ کیا۔میں نے دیکھا کہ دوسرے سیاح ایک طرف قطار در قطار بڑھ رہے ہیں۔میں بھی بھیڑ میں ہو لیا کہ شائد زائرین کے لئے خورد ونوش کا اہتمام ہو۔پتہ چلا کہ سب مینار پر جا رہے ہیں۔کوئی ۳۸۷ سیڑھیاں پھلانگتے ہم مینار کی چوٹی پر پہنچے۔تازہ ہوا کے جھونکے نے طبیعت بحال کی۔اوپر سے نیچے کا منظر خوب تھا مگر ایفل ٹاور کی طرح نہیں۔تھوڑی دیر آرام کیا۔اس سے پہلے کہ ہم نیچے اتریں ہمیں یاد آیا کہ یہ وہی مینار ہے جس نے وکٹر ہیوگو کے ناول ''ہیک آف نوتری ڈیم'' یعنی نوتری ڈیم کا کبڑا میں بڑا ڈرامائی رول ادا کیا ہے وہیں میں سوچ رہا تھا کہ جگہ جانی پہچانی لگتی ہے۔ایک تو تنہا دوسرے بھوک کی وجہ سے آج ذہن ٹھیک کام کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔بھئی خوب گرجا ہے اور میں نے وقت بھی خوب لگا دیا اور اس سے زیادہ وقت صرف ہوا تو اب کی بار مدر ٹریسا کی جگہ مجھے نوبل پرائز کا حقدار سمجھا جائے گا۔میں نے خود کو اس نیک فعل کے لئے تیار نہیں پایا اور واپسی کے لئے اتر آیا۔سینٹ لوئس سے ہوتے ہوئے سامنے ایک ہوٹل لامبرٹ میں داخل ہونا چاہا مگر کرخت آواز میں ایک پہرے دار نے روکا۔میں نے اشارے سے شکستہ فرنچ میں کہا ''یار تنگ نہ کر بھوک لگی ہے میری شکل پر نہ جا،کچھ فرانک تو ہیں ہی اپنے پاس،مگر وہ نہ مانا،بڑی مشکلوں سے میری سمجھ میں آیا کہ یہ فقط نام کا ہوٹل ہے اور کسی بھی عام بلڈنگ کو پیرس میں ہوٹل کہہ دیتے ہیں۔بہت خوب یعنی بہت سی عمارتیں جن کو میں ہوٹل سمجھ رہا تھا جیسے ہوٹل کلافی،ہوٹل سابائس،ہوٹل لازن وغیرہ صرف رہائشی مکان تھے اور وہ ان معنوں میں ہوٹل نہیں تھے جیسا ہم سمجھ رہے تھے۔اسی طرح سب سے دلچسپ بات یہ نظر آئی کہ ایک مکان پر ہوٹل ڈیو لکھا تھا۔معلوم ہوا کہ یہ پیرس کا سٹی ہاسپٹل ہے۔

کچھ بھوک اور کچھ سردی سے لہراتا ہوا میں دریائے سین کے ساحل تک آوارہ گردی کرتا چلا گیا۔راستے میں کیا کچھ نہ بک رہا تھا۔پرانی کتابیں،نقشے،تصویریں،پھولوں کے دستے وغیرہ غیرہ میں سب کچھ بھول کر کتابوں کی دنیا میں کھو سا گیا۔پرانی اور نئی کتابیں دونوں ایک ہی جگہ دستیاب تھیں۔اس ذخیرہ سے کچھ کتابیں دیکھیں دو ایک خریدیں۔زیادہ کی ہمت نہ ہوئی کیونکہ پچاس روپئے سے نیچے کی کتاب دستیاب نہ تھی۔دیکھتا بھالتا کچھ دور اور پہنچا۔ایک شریف زادے سے راستہ کا نام پوچھ لیا۔پتہ چلا کہ بولوار ساں مشال۔خیر صاحب جگہ اچھی تھی۔ایک چھوٹی سی ایک تختی پر St.Michel لکھا نظر آیا یعنی غلطی سے اگر سینٹ مائیکل کو ڈھونڈتے تو ڈھونڈتے رہ جاتے کیونکہ یہاں کے تلفظ کے اعتبار سے یہ ''ساں مشال'' ہوتا تھا۔اب شاہراہ مشال پر ایک بڑا ڈریگون والا فوارہ نظر آیا۔پتہ چلا کہ مزید تھوڑی چہل قدمی کے بعد کوچہ ساں مشال میں کھانا کیا ہر چیز سستی ہے کیونکہ یہ طالب علموں کا علاقہ ہے اور کوئی سو گز کی دوری پر پیرس کی مشہور یونیورسٹی سوربون ہے۔اس کوچے میں دورویہ سستے کیفوں کی قطار لگی تھی

۔بہت پھونک پھونک کر میں نے کیفے ڈیوکس، ماگوٹ میں قدم رکھا۔ معلوم ہوا کہ مجھ سے پہلے یعنی برسوں پہلے ژین پال ساتر Sartre بھی کافی نوش فرماتے تھے اور یہیں سے ۱۹۶۸ میں طالب علموں نے ایک عام ہڑتال کی تھی۔ میں نے سینڈوچ لیا اور کھانے لگا۔ ایک ہاتھ میں کولڈ کافی کا گلاس بھی تھا۔ باہر طالب علموں کے غول ٹہل رہے تھے بلکہ میری طرح کیفوں کے باہر لگے ہوئے مینو پڑھ کر سستے کھانے کا انتخاب کر رہے تھے۔ یہ طالب علمی کا زمانہ بھی کیا زمانہ ہوتا ہے۔ جیب ہلکی مگر خیالوں میں ''جوانی کی راتیں مرادوں کے دن'' میں اس قلندرانہ زندگی کا ابھی تک عادی ہوں۔ اس وقت مجھے علی گڑھ کی یاد ستا رہی ہے ''کوئی لوٹا دے مرے بیتے ہوئے دن'' اے، ایم یو علی گڑھ کا بھی کیفے ڈی فوس اور خاص کر دودھ پور پر آباد پھوس کے چھپر والے انٹر کانٹی نینٹل کیفے جہاں پروفیسر سے لے کر چپراسی تک ایک ہی میز پر روٹی اور سالن میں مصروف نظر آتے تھے۔ ہائے وہ سستا کھانا اور مہنگے کپڑے والے رات اور دن مگر اب یہ سب کہاں، ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا'' کھانے کی رسم کو نماز کی باقاعدگی کی طرح ادا کر کے ہم جین پینٹ پر ہاتھ صاف کرتے اٹھ گئے۔ چلئے صاحب یہاں کی درسگاہ بھی دیکھتے چلیں۔ کلاتی میوزیم کے قریب ہی درس گاہ سوربون آباد تھی۔ ایک سید صفت انسان رابرٹ دی سوربون نے ۱۲۵۳ء میں اس درسگاہ کے پہلے کالج کی بنیاد ڈالی تھی۔ فرانس کے طالب علموں کو روایتی آزادی ملی ہوئی ہے اور عوام بھی طلبہ کی بڑی قدر کرتے ہیں بلکہ سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ ہر جگہ سے زیادہ فرانس کے طالب علموں کو چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ مگر اس چھوٹ کا بے جا فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی نظر نہیں آیا۔ ان میں گورے بھی ہیں اور کالے بھی۔ یہاں پر ہر پرنسپل کے اور ہر رنگ کے طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

درس گاہ سوربون کے عقب میں کالج ڈی فرانس ہے جو روڈی ایکولاس پر واقع ہے۔ فرانس کے قابلِ فخر اساتذہ یہاں درس و تدریس کے کام میں مشغول ہیں۔ اس کالج کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تمام علوم و فنون کا درس مفت حاصل کیا جا سکتا ہے اور یہ ہر خاص و عام کے لئے ہے۔ اس کا سب سے زیادہ فائدہ امریکی اٹھا رہے ہیں۔ یہاں سیاحوں کے لئے بھی ایسا انتظام ہے کہ وہ کلاس کی پچھلی نشست پر بیٹھ کر کلاس کا معیار جان سکتے ہیں۔ میں بھی ایک سوشل سائنس کے کلاس میں گیا اور پچھلی سیٹ پر کچھ دیر بیٹھا مگر بد قسمتی سے لیکچر فرنچ میں ہو رہے تھے اور وہ چکنے گھڑے کی طرح سر پر سے گزر گئے۔ یہ بات سمجھ میں آئی کہ یہاں تعلیم مفت حاصل کرنے کے لئے فرنچ جاننا ضروری ہے، اس تعلیمی مرکز سے نکل کر ہم اپنے نقشے میں دیکھ رہے تھے کہ اور کہاں جایا جائے۔ ایک جگہ لکھا تھا: Mosque

میں سمجھ گیا کہ کسی مسجد کا ٹھکانہ ہے۔ حیرت اور خوشی دونوں ہوئی کہ اس باغ و بہار اور شہر نگاراں میں خدا کا نام لینے والے بھی ہیں۔ جارڈن نامی باغ اور چڑیا گھر سے ہوتے ہوئے ہم خدا کے گھر کی طرف چلے۔ راستے میں آرینا دیس لوٹیس نامی رومن اکھاڑہ بھی ملا جو اٹھارہویں صدی کے رومن طرز کا تھا اور شاید کھدائی میں نکلا تھا۔ تقریباً سو قدم چل کر ہم اس نا معلوم مگر پیرس کی واحد شاہی یا جامع مسجد تک پہنچے۔ یہ روڈ اینٹن کا علاقہ تھا۔ اس مسجد کو دیکھ کر فتح اندلس کے فاتح مسلمانوں کی اذان کی آوازوں سے کان گونج اٹھے۔ یہاں عربی نسل کے فرنچ نظر آئے۔ افریقی بھی ملے، الجزائری، مراکشی بھی، اسپین اور ٹونسیا کے مسلمانوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ یہ لوگ مل کر بہت خوش ہوئے مگر زبان ہمارے اخلاص کے درمیان حائل تھی۔ خیر ایک صاحب جو قریب ہی ایک ہوٹل چلا رہے تھے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں انہوں نے بتایا کہ ۱۹۲۷ء میں پیرس کے عربی النسل باشندوں کے لئے یہ مسجد بنائی گئی تھی۔ سفید سنگ مرمر کی عمارت بلند قامت مینار اور منقش گنبد چودھویں صدی کے ہسپانوی فن معماری کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ اس علاقے میں مسلمان آباد تھے۔ زبان ان کی عربی یا پھر فرنچ تھی۔ قدیم طرز کی دکانیں اور چند مسلم کیفے بھی تھے۔ پیرس کی مغربی اور مادی تہذیب میں یہ علاقہ مشرقی اور خالص روحانی ماحول لئے اپنے آپ میں مگن تھا۔ کیفے میں افریقی اور عربی موسیقی کانوں میں رس گھول رہی تھی جو کیسٹ ٹیپ سے سنائی جا رہی تھی۔ میں نے گوشت عرصے سے نہیں کھایا تھا۔ ایک ہمدرد امیر حمزہ جو الجزائر کے تھے ان کے چھوٹے سے کیفے میں بھنا ہوا گوشت اور ایک خاص قسم کی عربی ڈش 'کُس کُس' ملی جو بڑی مزے دار تھی۔ کھانے سے زیادہ اپنے ہم عقیدہ لوگوں سے مل کر خوشی حاصل ہو رہی تھی۔ کاش میں فرنچ جانتا اور ان لوگوں سے کھل کر اپنے جذبات کی ترجمانی کر پاتا۔

●●●

محل دو محلے اور گلستانِ وارسائی

پیرس کا مارا سیاح یہاں کی شاہراہوں کی صبح اور نائٹ کلبوں کی راتوں میں اتنا کھو یا بلکہ الجھا رہتا ہے کہ اسے پیرس کے قرب و جوار کے بارے میں دیکھنے اور سمجھنے کا موقع نہیں ملتا اور اس طرح وقت گزرنے کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب روانگی کا دن آ پہنچتا ہے۔ میرے حصے کے شب و روز کو بھی پر لگ گئے تھے۔ آج میرے نزول کو ٹھیک ہفتہ ہونے کو آیا۔ اتنا دیکھا مگر اب بھی بہت کچھ دیکھنا تھا، بس ہر وقت یہی گنگناتا ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا......''

خیر میرے کرم فرماؤں نے مشورہ دیا کہ وارسائی کے باغات اور محل ضرور دیکھ لو۔ پتہ چلا کہ میرے مسکن سے صرف بیس کیلومیٹر پر واقع ہے۔ بس میں تیار ہو گیا۔ اس سفر کے لئے میں نے میٹرو، زمین دوز ریل پسند کی اور صبح ٹھیک نو بجے میں پورٹے شاں کلاں اسٹیشن پر ریل کا انتظار کر رہا تھا۔ پلیٹ فارم کے آخری سرے پر ایک بڑا سا ٹی وی لگا ہوا تھا اس کے اسکرین پر رنگین تصویریں آ رہی تھیں۔ دیکھنے پر ایسا معلوم ہوا کہ کسی بڑی سڑک کے کنارے کا سین چل رہا ہے۔ کیونکہ لوگوں کی آمد رفت دکھائی جا رہی تھی۔ پھر ایسا لگا سین کسی ریلوے پلیٹ فارم کا ہے جگہ کچھ دیکھی لگی۔ اب اسکرین پر ایک صاحب اپنے عجیب وغریب کتے کے ساتھ خراماں خراماں چلے آ رہے ہیں۔ ساری باتیں بے ربط معلوم ہو رہی تھی۔ میں الجھا ہوا تھا کہ یہ کیسا پروگرام چل رہا ہے۔ اچانک میں نے اپنے پیچھے بھونکنے کی آواز سنی۔ گھوم کر دیکھا وہی صاحب اسی کتے کے ساتھ میرے برابر آ کر کھڑے ہو گئے۔ اب اسکرین پر ایک ریل چلی آ رہی تھی۔ ساتھ ہی پلیٹ فارم پر گڑگڑاہٹ ہوئی اور ریل سامنے لگ رہی تھی۔ مزید کچھ سوچے بغیر میں ریل میں سوار ہوا۔ کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہوئے آخری بار اس ٹی وی کی طرف دیکھا۔ میں خود ریل میں سوار ہوتے ہوئے اسکرین پر جلوہ افروز تھا۔ اب ساری بات سمجھ میں آئی۔ یہ ٹی وی نہیں بلکہ کلوز سرکٹ کیمرہ تھا جو اسکرین پر پلیٹ فارم پر رونما ہونے والے واقعات پیش کر رہا تھا۔ ساتھ ہی ریل کی آمد و رفت بھی دکھا رہا تھا۔ اس سے حادثہ اور چوری کی چیکنگ بھی ہوتی ہے۔ صبح آفس کا وقت تھا اور بھیڑ کچھ زیادہ ہی تھی۔

تھوڑی دیر میں مجھے ایک سیٹ مل گئی اور میں نقشے کے ذریعہ آنے والے اسٹیشنوں کو ملا کر دیکھ رہا تھا کہ میں صحیح سمت جا رہا ہوں یا غلط کیونکہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ مجھے جانا ہے مشرق اور میں سوار ہو گیا مغرب کے لئے مگر دو ایک اسٹیشنوں سے ہی غلطی کا اندازہ کر کے فوراً سمت بدل لیا کرتا تھا۔ ہر دو تین منٹ پر گاڑیاں مل جاتی ہیں اور یہ اتنی برق رفتار ہیں کہ زیادہ وقت برباد نہیں ہوتا تھا۔

چند سیاحوں کو چھوڑ کر سارے مسافر آفس جانے والے یا پھر کاروباری لوگ لگتے تھے۔ تقریباً آٹھ اسٹاف کے بعد میں پورٹے ڈی وارسائی پر اترا۔ باہر آیا تو معلوم ہوا کہ کچھ فاصلے پر وارسائی کے محل اور باغات ہیں۔ یہاں شہر کی بھیڑ نہیں مگر سیاحوں کی رونق تھی۔ تھوڑی سی چہل قدمی کے بعد میں وارسائی کے محل کے احاطے میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ شاہ لوئی چہاردہم کا اعلیٰ ذوق اور شاہی مزاج تھا جس نے تئیس (۲۳) سال کی عمر میں ایک عالیشان قدرتی مناظروں سے گھرا گھنے جنگلوں کے درمیان ایک نفیس محل اپنی رہائش کے لئے تعمیر کرانے کا منصوبہ بنایا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ شہری زندگی سے دور سکون کا متلاشی تھا۔ اس پورے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں پورے پچاس سال لگے مگر کام شروع ہونے کے بیس سال بعد جب خاص محل تیار ہو گیا تو ۱۶۸۲ء میں شاہ لوئی نے اپنی مکمل فوج اور درباریوں سمیت جو کہ تقریباً ۲۰ ہزار لوگوں پر مشتمل تھی اپنی خود ساختہ جنت کو آباد کر لیا۔

ان صبر آزما معلومات کو نوٹ کرتے ہوئے میں گیٹ کی طرف بڑھا۔ سیاحوں کی ٹولیاں گائیڈ حضرات کی مدد سے تفصیلات معلوم کر رہی تھیں۔ میں اس کوشش میں تھا کہ کوئی انگریزی بولنے والا مل جائے اور میری معلومات میں مزید اضافہ ہو۔

گائیڈ حضرات ٹورسٹ بسوں کے ذریعہ آتے تھے اور اپنے گروپ میں مصروف تھے۔ قسمت سے ایک بوڑھا فوٹو گرافر جو پولورائیڈ کیمرے سے تصویریں کھینچ رہا تھا، مجھ سے ٹکرا گیا۔ میں نے اس شرط پر تصویریں بنوانی چاہیں کہ پہلے وہ مجھے یہاں کے تاریخی قصے سنائے۔ بوڑھا تیار ہو گیا اور مجھے لے کر آگے بڑھا۔ دیوانِ خاص اور دیوانِ عام سے ہوتا ہوا وہ شاہزادوں کے استقبالیہ ہال میں لایا۔

یہاں اٹھارہویں صدی کے مجسمے، قد آدم عکس اور قیمتی جھاڑ فانوس اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ شاہ اور ملکہ کی خواب گاہ میں وہ سکوت طاری تھا جیسے وہ اب تک آرام فرما ہیں۔ ملکہ کا سنگھار میز بھی اب تک سجا سجایا تھا۔ کمرے کی جالی اور سرسراتے پردے ماحول کو پراسرار بنائے ہوئے تھے۔ اس سے متصل ایک مرصع او پیرا ہاؤس تھا جسے استاد گیبریل Gabriel نے زندگی بخشی تھی۔ اس کی عطر بیز ہوا سے یوں محسوس ہوا کہ آج کی شب یہاں شاہی راگ رنگ کا اہتمام ہے۔ یہاں ہر کمرے اور برآمدے میں سورج دیوتا Le Rai Soleil کی تصویر یا پھر مجسمہ نصب تھا۔

بوڑھے فوٹو گرافر نے کہا کہ اب میں تمہیں اس محل کا سب سے مشہور شیش محل دکھاؤں گا۔ میں نے لقمہ دیا چچا شیش محل تو ہمارے لال قلعہ میں بھی ہے۔ اسنے فوراً کہا مگر ایسا نہیں ہوگا۔ یہ دنیا میں اپنے طرز کا واحد ہے اور واقعی یہ منفرد نکلا۔ اسے Galerie Des Glaces کہتے ہیں۔ اسکی لمبائی ۲۳۵ فٹ ہے۔ جتنا یہ خوبصورت ہے اتنا ہی تاریخی اہمیت کے پس منظر کا حامل۔ فرینکو پروشین جنگ کے زمانے میں یہ محل جرمن فوج کا ہیڈ کوارٹر تھا اور ۱۸۷۱ء میں پروشیا Prussia کے بادشاہ کو یہاں جرمنی کا شہنشاہ مقرر کیا گیا تھا۔ سب سے خاص بات یہ کہ ۱۹۱۹ء میں جنگ کے بادل چھٹ گئے تو ایک معاہدے پر شکست خوردہ جرمنی نے دستخط کئے اور اسے Treaty of Varailles ٹریٹی آف وارسائی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس شیش محل میں میری طرح لاتعداد داڑھیاں اور بوڑھے کے بے حساب کیمرے کے علاوہ بھی کچھ چیزیں قابل قدر تھیں اور وہ محل کے باہر پھیلے ہوئے باغات کا عکس محل کے کشادہ دریچوں سے باہر کا خوبصورت منظر دیوار پر لگے ہوئے شیشوں میں جھلملا رہا تھا۔ آنکھ بند کر کے اچانک اس پر نظر پڑے تو معلوم ہوتا ہے گویا آپ پائیں باغ میں کھڑے ہیں۔ جتنا دلکش محل کا اندرونی ماحول تھا اس سے کہیں زیادہ روح افزا باہر باغات کا سلسلہ تھا۔ نرگسی تختے، عشق پیچاں میں لپٹے ہوئے مجسمے، سرو و صنوبر کے درخت، منہ اٹھائے شاہ بلوط، سبز مخملی گھاس کا قالین، قاعدے سے تراشے ہوئے پودے، کیاریاں اور جھاڑیاں، صاف شفاف جھیل اور نالے۔ ان سے بالاتر دنیا کے حسین ترین رنگ برنگے فوارے جن کی تعداد ۱۴۰۰ ہے۔ پورے علاقے کو تر و تازہ کرتے رہتے ہیں اور ساون کی شوخ کم کم پھواروں کا مزہ دیتے ہیں۔

اسی شاہی باغ کو جو ۲۵۰۰ ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے سر کرنے میں تقریباً پانچ گھنٹے لگے۔ باغ کے عقب میں ایک ''ٹرائنون'' نامی چھوٹا گلابی مرمر کا محل جو شاہ لوئی کے خاص مصرف میں رہتا تھا۔ بعد میں اس نے محل کو اپنی ملکہ میری کے لئے وقف کر دیا۔ ملکہ نیک دل مگر کم عقل تھی اور اس کی سادگی نے فرنچ ملکاؤں کے نام پر کلنک کا ٹیکہ لگا دیا۔ واقعہ بہت مشہور ہے کہ ۱۷۷۵ء میں ایک بغاوت کے دوران بھوکے عوام اسی گلابی محل کے باہر پرزور احتجاج کر رہے تھے۔ ملکہ نے دریافت کیا کہ معاملہ کیا ہے'' جب اس سے کہا گیا کہ جنتا بھوکی ہے اور روٹی کے لئے شور مچا رہی ہے تو ملکہ نے بہت سادگی سے جواب دیا کہ ''اگر روٹی نہیں ہے ان سے کہو کیک کھائیں'' اس سادگی نے نہ صرف شاہ لوئی کی گردن اڑوائی بلکہ خود ملکہ کو بھی جانِ عزیز سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ اس تاریخی سانحہ کو سن کر خواہ مخواہ میرا موڈ ٹریجک ہو گیا۔ اس غم کو دھونے کے لئے میں نے باغ کی پرلی طرف ایک کیفے کا انتخاب کیا۔ بڑا عجیب نام تھا Brasserie D. France تیسری پہر ہونے کو تھی۔ دوپہر کا کھانا تو شاہوں کے چکر اور فوٹو گرافر چچا کے لیکچر میں گول ہو گیا تھا۔ اب ہندستانی حساب سے شام کے ناشتے کا وقت تھا مگر اس باغ و بہار میں سنگھاڑے، تکونے اور الائچی والی چائے کہاں؟ خیر اپنے ساتھ چچا بھی تھے۔ میں نے جان بوجھ کر بوڑھے فوٹو گرافر کا نام نہیں پوچھا تھا۔ اس دوران بڑے میاں اپنا کام بھی کرتے جا رہے تھے، یعنی حضرت نے نہ صرف میری تصویریں لیں بلکہ موقع سے جو شکار ملتا اسے حلال کرتے جا رہے تھے۔ میں نے اپنے لئے کافی اور کروساں Crossant

نامی بن منگائے چچا نے صرف ایک بیئر کی فرمائش کی۔

بیئر کے دو گھونٹ اتارنے کے بعد بوڑھے نے گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر ایک بھرپور نگاہ سے میرا ایکسرے کر ڈالا۔ میں نے پوچھا خیریت چچا۔ بڑے میاں نے کہا کہ تمہارے ساتھ دن اچھا گزرا۔ صبح جب تم نے مجھ سے بات کی میں اسی وقت بھانپ گیا کہ تم کوئی تباہ رائٹر قسم کی چیز ہو۔ کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔ میں نے کافی کی چسکی لی اور کہا کہ میں گمنامی کے شہر کا باشندہ ہوں۔ لکھنا میرا شوق اور آوارگی میری عادت ہے۔ بس اس سے زیادہ میں خود اپنے بارے میں نہیں جانتا۔ چچا نے دن بھر میں میری کوئی دس تصویریں اتاری تھیں اور ساتھ گردش کی تھی مگر پتہ نہیں کیوں چلتے ہوئے اس نے صرف پچاس فرانک نذرانہ لیا اور جاتے جاتے آخری ٹپ یہ دے گیا کہ بس والے سے کہنا La-Malmaison پر اتار دے۔ باقی خود دیکھ لینا۔ بائی!

ہدایت کے مطابق میں ایک ہری بھری بستی ''لاملمیشان'' پر بصد احترام اتر گیا۔ ہوا خنک، صاف فضا اور موسم خوشگوار تھا۔ گلاب کی بھینی بھینی خوشبو ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اس جگہ کی معلومات بس میں ہی کر لی تھی۔ نپولین اور اس کی محبوبہ جوزفین کا عشق یہیں جوان ہوا تھا۔

ملمیشان ایک سادہ مگر دلکش مکان تھا جہاں جنرل نپولین بونا پارٹ نے اپنی جذباتی محبت کو پروان چڑھایا تھا اور شادی کے بعد اپنی زندگی کے خوشگوار ترین ایام یہاں گزارے تھے۔ آج بھی اپنی سادگی کے ساتھ یہ مکان سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ کشادہ کمرے، خوبصورتی سے آراستہ فرنیچر، مسہری اور روزمرہ کے استعمال کے دیگر سامان شاہی خلعت اور جواہرات اور ملکہ کے زیورات وغیرہ اس کے علاوہ جنگجو نپولین کا زرہ بکتر، جنگ کے ہتھیار، خیمہ، نقشے اور نوٹ بک، وہ قلم اور میز جس پر کوڈ نپولین ''Code Napoleon'' مرتب کیا گیا تھا۔ ان چیزوں سے پرے ان کے خاندان کے افراد کی قدآدم تصویریں بھی آویزاں تھیں۔ باہر سے مکان کی سادگی سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اسکے اندر ایک دنیا آباد ہے۔ اب اس پر شہر خموشاں کا سا سکوت طاری ہے۔ مکان کے چاروں طرف مختلف پھولوں خصوصاً گلاب کا باغ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گلاب کے ان پودوں کو جوزفین نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔

http://www.kitaabghar.com
urdukutabkhanapk.blogspot.com



کچھ نصیحتیں کچھ فرمائشیں یاروں کی!

کلکتہ سے روانہ ہونے سے چند روز قبل میں تمام ساتھیوں سے ملاقات میں مشغول تھا۔ کوئی فیئر ویل ڈنر دے رہا تھا تو کوئی فرمائشوں کی لمبی فہرست۔ ظہیر انور کہ میرے ہم رکاب نوٹنکی والے ہیں اور مجھ سے زیادہ قابل اور مقبول بھی ہیں بار بار تنبیہ کرتے جا رہے تھے کہ دانش میاں بیکٹ Samuel Backett کے ڈرامے ضرور دیکھنا اور بریخت Brecht کے ڈرامے بھی ورنہ میں تمہیں معاف نہیں کروں گا اور ہاں موقع ملے تو میرے لئے گروٹوسکی کی کتاب ——— Towards a poor theatre ہاں ایک اور کتاب کامو (Camus)
Life and works! Camus یاد سے لیتے آنا بس! باقی تو تم خود لاؤ گے۔

میرے کرمفرماؤں اور رفیقوں میں ایک رفیق انجم بھی تھے۔ میں ان سے خاص طور پر اس لئے ملنے گیا تھا کہ وہ فرانسیسی زبان کا ڈپلوما کر رہے تھے۔ ان سے کچھ خاص خاص الفاظ معلوم ہوئے۔ ساتھ ہی انہوں نے کچھ اور تفصیلات پیرس کی بتائیں نیز ایک شاہراہ کا نام ایک پرزے پر لکھ دیا، وہ تھا Champ Elysees اور بڑے وثوق سے بتایا کہ اگر میں پیرس ہوائی اڈے سے سیدھا وہاں جاؤں اور اس شاہراہ کی زیارت کر کے واپسی کے لئے جہاز پکڑ لوں تو سمجھ لینا کہ تم نے پیرس پورا دیکھ لیا۔ مجھے جتنی عقیدت رفیق انجم سے ہے اس سے زیادہ رشک ان کی جنرل نالج پر ہے، کیونکہ زندگی میں کچھ اور کیا ہو یا نہ ہو سائیں نے کتابیں بہت پڑھی اور جمع کر رکھی ہیں۔ میں ان کے مفید مشوروں کو کیسے رد کر سکتا تھا۔ میں پیرس کے خیالوں میں گم جب پرزہ جیب میں رکھنے لگا تو انہوں نے بڑی انکساری سے کہا کہ پرزے کی پشت پر ایک چھوٹی سی فرمائش بھی ہے۔ موقع ملے تو لیتے آنا۔ خیر صاحب، فرمائش ایک چھوٹے سے لائٹر کی تھی جس کا نام تھا ''Dupont''۔

آج پیرس کی گیارہویں شب ہونے کو آ رہی ہے۔ سات بجنے میں ابھی پانچ منٹ باقی ہیں۔ سورج ابھی جوان ہے اور میں آوارۂ کوئے بتاں میں اپنے رفیق کے دیئے ہوئے ٹھکانے کو کوچہ کوچہ، قریہ قریہ ڈھونڈ رہا ہوں مگر توبہ ہے۔ ایک توبہ آج سے تین روز قبل کی تھی جب فرمائشی لائٹر ڈوپوں کی قیمت معلوم ہوئی تھی۔ حضرت فقط ہندستانی ۱۷۰۰ (سترہ سو روپئے)۔ میاں اتنے کی تو ہمارے یہاں ایک سگریٹ کی دکان ہوئے ہے۔ میں نے دکاندار سے معلوم کیا کہ بھائی اس لائٹر سے شعلہ کیا کوہِ طور والا نکلتا ہے۔ بیچارہ مجھے یوں گھور رہا تھا گویا میں نے بھنگ چڑھا رکھی ہے۔ پھر میں رفیق صاحب پر اور دکان دار مجھ پر بڑبڑایا۔

ہاں تو ہم بھٹک رہے تھے شاہراہ Champ Elysees کے چکر میں، ارے صاحب کوئی بھی شریف آدمی اس نام کو ''چیمپ ایلی سیز'' ہی پڑھے گا بس میں کمبخت کو اسی نام سے مسلسل دس دنوں سے ڈھونڈ رہا تھا جس سے دریافت کیا اس نے بدک کر کندھا اچکایا اور اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ بہتوں نے مسکرا کر یوں دیکھا گویا میں بنارس میں لال قلعہ ڈھونڈ رہا ہوں۔ کبھی کبھی رفیق صاحب پر غصہ بھی آتا کہ عجیب مذاق ہے۔ خاک فرانسیسی میں ڈپلوما کر رہے ہیں مگر یہ سوچ کر صبر کر لیتا کہ آدمی قاعدے کے ہیں، کچھ گڑبڑ میں ہی کر رہا ہوں۔ آج میں ٹھان کر نکلا تھا کہ اس جگہ پہنچنا ہی ہے۔ اچانک مجھے ایک پولس والا نظر آیا۔ میں نے لپک کر اسے جا لیا، اپنا مدعا پیش کیا، انگلش وہ بھی نہیں جانتا تھا، کندھا اچکانے کے بجائے وہ میری پریشانی سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں اسے سمجھانے سے قاصر تھا، تھک کر میں نے جیب سے رقعۂ رفیق نکالا اور اسے دکھا کر اشارے سے پوچھا کہاں ہے؟ پرزہ دیکھتے ہی وہ بولا: اوہ، شانزالیزے'' کیا۔ کیا کہا بھئی ذرا مکرر بھائی میاں! بھائی میاں نے دوبارہ دہرایا ''شانزالیزے''، میں نے مرسی بکو یعنی

شکریہ کہتے ہوئے اپنا سر پکڑ لیا۔ لاحول ولا...... میں پچھلے دس دنوں سے تلفظ کی غلطی کر رہا تھا۔ یوں تو فرنچ کے تلفظ نے بہت گل کھلائے تھے مگر یہ گل بکاؤلی نکلا، خوب جناب شاہراہ شانزالیزے۔ شاید رفیق صاحب نے یہی کہا ہوگا، ڈپلوما والے جو ٹھہرے۔ کاش میں نے اسے انگلش کے بجائے اردو میں نوٹ کیا ہوتا۔ آخر اپنی زبان اپنی زبان ہوتی ہے۔ میں پولس والے کے بتائے ہوئے راستے پر ہولیا۔ میں نے عہد کیا جو گزری سو گزری۔ اب جو باقی ہے اسے زبان کے بجائے نقشہ دکھا کر پوچھیں گے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ ہم اس علاقہ میں کئی بار بھٹک کر گئے تھے یعنی جسے ڈھونڈتے تھے گلی گلی والا معاملہ تھا۔

میں کوچہ چارلس دیگال سے ہوتا ہوا شاہراہ شانزالیزے پہنچا۔ سبحان اللہ! اس شہرِ گلگشت میں شانزالیزے نفیس ترین آوارگی کا مرکز نکلا۔ یہ تقریباً ایک میل تک پھیلا ہوا ہے جہاں سے شاہراہ شروع ہوتی ہے وہاں ٹھیک داخلے پر دو دیو قامت جنگلی گھوڑوں کا مجسمہ ہے۔ ساتھ میں حبشی غلام انہیں قابو میں کرنے کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ میں نے دل میں سوچا اے اس مقامِ دلگیر کے دیوانو ذرا خود کو قابو میں کرنے کی فکر کرو۔ اس مجسمے کو Chevaux D Marly کہتے ہیں۔ یہ اٹھارہویں صدی کے فن کا نمونہ ہے۔

شانزالیزے دو خاص حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ مشرقی حصے میں ایک بڑا خوب صورت پارک جس میں چند محلات، تھیٹر اور بچوں کا پسندیدہ کٹھ پتلی گھر اور ہنڈولا وغیرہ ہے۔ مغربی حصہ بالکل جدا ہے۔ یہاں تجارتی مرکز، عالیشان ماڈرن اپارٹمنٹ، سنیما گھر، کیفے اور دلکش دکانوں کی لمبی قطاریں ہیں۔ اسی راستے پر چلتے ہوئے پیرس کے کچھ معروف تھیٹر ہیں۔ جیسے Thetre Des Ambasadeurs اور Theatre De Marigny ملے جو دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان تھیٹروں کو دیکھ کر مجھے بے اختیار اپنے یار ظہیر انور کی پرخلوص نصیحت یاد آ گئی۔ ویسے بھی ناقدین کی رائے میں ظہیر کا شمار ''اینگری ینگ مین'' میں ہوتا ہے۔ میں اسے غصہ نہیں دلا سکتا۔ اس کے مشورے کا پاس رکھتے ہوئے میں نے خود کو تھیٹر کے لئے آمادہ کیا۔ دو ایک تھیٹر میں گردش کے بعد پتہ چلا کہ حضرت بیکٹ کا ڈرامہ فلاں ہال میں چل رہا ہے۔ میں نے دوڑ دھوپ کر تھیٹر ڈھونڈ نکال ہی لیا جہاں Waiting for Godot چل رہا تھا۔ ۳۰ فرانک کا ٹکٹ لیا اور میں ہال کے کونے والی سیٹ پر جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر میں سمجھ میں آیا کہ ڈرامہ فرنچ میں چل رہا ہے۔ میں زبان سمجھنے سے قاصر تھا مگر پروڈکشن، کاسٹیوم، سیٹ، لائٹنگ اور دیگر تکنک خوب بھائی۔ بہت کچھ سیکھ کر اور کچھ نہ سمجھ کر اپنے انٹلکچول یار کو دعا دیتا ہوا باہر نکلا۔ میں خوش تھا کہ آج اوریجنل چیز دیکھی۔ سمجھ اور ناسمجھ تو بس بہلاوے کی باتیں ہیں۔ اصل چیز ہے Originality وہ کتنوں کو میسر ہے! باہر اندھیرا پھیل چکا تھا اور راستے روشنی میں نہائے ہوئے تھے۔ پتہ چلا کہ تھیٹر کے ٹھیک پشت پر ایک اسٹامپ مارکیٹ ہے جہاں ہفتہ کے روز پانچ سال کے بچے سے لے کر ساٹھ سال کے بوڑھے تک ٹکٹ جمع کرنے والے اپنے رنگ برنگی ٹکٹ کے البم اور زرق برق لباس میں ''تبادلہ'' خرید و فروخت اور خوش گپیوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ کچھ فاصلے پر دو محل نظر آئے۔ گرانڈ پیلس اور پٹیٹ پیلس یہ دونوں نمائشوں اور کاروباری مجلسوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے کچھ حصوں میں عالمی آرٹ اور فنونِ لطیفہ کی نمائش کا بھی اہتمام ہوتا ہے جس کا موضوع ہر ماہ بدلتا رہتا ہے۔ ان مقامات کو دیکھنے کے لئے ہم آگے بڑھے تو صرف سپر مارکیٹ اور فیشن ایبل اسٹوروں کا سلسلہ تھا۔ یہاں بیوٹی پارلر اور سیلون اور Hleath Spa کی بھی بھرمار تھی۔

ڈپارٹمنٹل اسٹور الگ ساری دنیا کے لوازمات سے پر نظر آئے۔ مجھے کچھ شاپنگ بھی کرنا تھی مگر روشنی کا ایک بحرِ بے کراں تھا اور میں اس میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔ بہت گھوم پھر کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ کچھ لوں یا نہ لوں تھوڑا سینٹ پرفیوم لیتا چلوں مگر میرے بیگ میں پرفیوم کی فرمائشی فہرست اتنی طویل ہے کہ اسے پڑھنا محال تھا پھر بھی کچھ دوستوں کو خوش رکھنا پڑتا ہے۔ بس میں نے ایک شیش محل نما دکان کا انتخاب کیا۔ اندر لوگوں بلکہ نازنینوں کی بھیڑ تھی۔ سیکڑوں چھوٹی بڑی سادہ اور خوبصورت شیشیاں کھلی ہوئی میز پر پڑی تھیں یعنی خوشبوؤں کی دعوتِ عام تھی۔ میں نے دوسروں کی دیکھا دیکھی ہمت کی اور دو چار شیشیوں کو الٹا پلٹا۔ تھوڑا آگے کوٹ پر چھینٹا، تھوڑا چین پینٹ پر ملا۔ بہت سی خوشبو مل کر ایک عجیب سی خوشبو دماغ اڑائے دے رہی تھی۔ ہر خوشبو ایک سے بڑھ کر ایک، میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا اور کیسے خریدار جائے۔ اتنے میں ایک کھنکتی آواز نے مجھے چونکا

دیا۔ فرنچ میں کچھ کہا گیا۔ میں سمجھ گیا دھندے کی بات کی جا رہی ہے کہ کیا لو گے پیارے؟ اچھی آواز میری کمزوری ہے۔ میں خواہ مخواہ مرعوب ہو گیا۔ میں کچھ کہنے جا رہا تھا کہ یاد آ گیا کہ طارق جگر نے ''ایوننگ ان پیرس'' کی فرمائش کی تھی۔ میں نے بڑے مشینی انداز اور فرنچ اسٹائل میں کہا:

Madam, Parfum-evening in Paris

مادام کے چہرے پر ایک رنگ آیا ایک گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئیں، پھر سر ہلا کر کہا، نے، نے یعنی نہیں ہے۔ پھر بھی میں بے حیائی سے ڈٹا رہا کہ صاحب نہیں کیسے، مال نکالو، ایک دوسری خاتون مجھے ٹک ٹک دیدم کے عالم میں تک رہی تھیں۔ شاید انہیں مجھ پر ترس آ گیا اور اٹک اٹک کر انگلش میں بتایا کہ یہ برانڈ اب پیرس میں نہیں ملتا اور بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔ اب کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا۔ مجھے خاموش دیکھ کر ایک لمبی فہرست بڑی بی نے تھما دی اور مشورہ کے طور پر بتایا کہ Christian Dior, Ravillon, Patou Rochas ,Chanel وغیرہ وغیرہ ان دنوں مقبول ہیں۔ خیر پیرس میں ملتا ہو یا نہ ملتا ہو مگر کلکتہ میں ضرور مل جائے گا۔ مجھے یاد آیا کہ چونا گلی کی کسی چھت پر دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ خوشبو جات، کریم، اسنو، ٹوتھ پیسٹ تیار کی جاتی ہے کیونکہ ہماری قوم خود کفیل ہوتی جا رہی ہے۔ ''ایوننگ ان پیرس'' بھی ضرور بنتی ہو گی۔ میرے خیال میں اب اس کی ایجنسی ایسی چھتوں تک رہ گئی ہے، ٹھیک ہے وہیں سے لے لیں گے مگر اچھی آواز بھی کیا بری شئے ہے۔ جب میں اپنے ذہن میں اس سینٹ کے فارمولے کے بارے میں سوچ رہا تھا تو محترمہ نے دوبارہ گُل افشانی کی۔ مجھے لگا وہ فرما رہی ہیں کہ کچھ تو کہئے کہ لوگ کہتے ہیں۔ پھر کیا تھا میری خودداری نے آڑے ہاتھوں لیا۔ میں نے آرڈر دے ہی ڈالا کہ جناب من کوئی اچھی سی درباری خوشبو اپنی پسند کی عطا کر دیں۔ ہاں شیشی چھوٹی سے چھوٹی ہو، یہی چند چھٹانک یا کچھ ماشے کی۔ میں اپنی جگہ یہ عقلمندی کر رہا تھا کہ چھوٹی شیشی کم قیمت کی مل جائے گی مگر خدا بھلا کرے اس ظالم حسینہ کا ایک بہت چھوٹی سی ننھی شیشی لائی گئی —— نام تھا Chanel-10 اور قیمت صرف بیس ڈالر یعنی دو سو روپئے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اچھی آواز، خوبصورت شیشی اور طارق میاں کی دوستی کی قیمت ادا کر کے ہلکا پھلکا ہو کر وہاں سے نکلا۔ شاپنگ کا بخار اتر چکا تھا۔

میں شانزا شالیزے کے آخری سرے پر پہنچ گیا تھا۔ یہاں اتنی بھیڑ نہ تھی۔ دور سے ایک کیفے کا نیون سائن ''Fouquet's'' نظر آ رہا تھا، کچھ اور بھی بار اور ریستوراں وہاں تھے مگر ہم نے پہلے کو چنا اور باہر پڑی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ تھکن محسوس ہو رہی تھی، بھوک بھی تھی مگر دن بھر کی آوارگی، تھیٹر، شاپنگ کے بعد جیب میں چند فرانک اور واپسی کا ایک ٹوکن پڑا ہوا تھا۔ میں نے ایک پیسٹری اور فریش لائم کا آرڈر دیا۔ مجھے چند منٹ ہوئے تھے کہ پیچھے سے کسی نے میرا نام پکارا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ کوئی اور ہو گا۔ ایک میں ہی جاوید نہیں پیرس میں مگر اچانک خیال آیا کہ جناب چورنگی میں نہیں شاہراہ شانزالیزے میں براجمان ہیں۔ گھوم کر دیکھا پال راستہ پار کر کے میری طرف آ رہے تھے۔ بڑی گرمجوشی سے ملے کیونکہ کئی دنوں کے بعد سامنا ہو رہا تھا۔ میں نے دن بھر کی تفصیل بتائی اور خبر دی کہ جلد ہی پیرس سے میرا آب و دانہ اٹھنے والا ہے۔ بیرا فریش لائم لے آیا۔ میں نے پال کی طرف بڑھایا مگر اس نے انکار کر دیا۔ فرنچ تکلف نہیں کرتے اس لئے میں شروع ہو گیا۔ فارغ ہو کر ہم لوگ اٹھے، کچھ دور پر پال کی گاڑی پارک تھی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ سامنے ایک مرکری سائن چم چم کر رہا ہے وہ Lido تھا۔ پال نے بتایا کہ یہ اس علاقے کا بہت مشہور قحبہ خانہ ہے۔ گاڑی اب چل پڑی تھی۔ شانزالیزے کو واقعی لاہور کا مال روڈ یا پھر کلکتے کی چورنگی کہا جا سکتا ہے۔ اس علاقے سے نکلتے ہی ایک اور سائن بورڈ پر نظر اٹکی۔ میں مسکرا دیا Crazy Flotse Horse Saloon بہت خوب! مسٹر پال کیا یہاں گھوڑوں کی حجامت کا انتظام ہے۔ نام سے ایسا ہی لگتا تھا۔ پال نے ہنس کر کہا، گھوڑوں کی نہیں ہاں قیس کے ہمزاد اور دل جلوں کی حجامت ضرور ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک مشہور بار اور شبینہ کلب تھا۔ اس سے پہلے کہ ہماری حجامت کا نمبر آتا گاڑی کافی آگے نکل چکی تھی۔



ابھی خزاں ہے تو ہے یہ عالم......

ستمبر کا مہینہ پیرس میں جشن کا مہینہ ہوتا ہے، گو موسم بہار الوداع چاہتا ہے اور خزاں کی آمد آمد ہے۔ پتے شاخوں سے جدا ہو رہے ہیں مگر پیرس میں ہر موسم اپنا ایک الگ مزاج رکھتا ہے۔ اس ماہ یہاں ساری دنیا کے سیاح اور کاروباری لوگ رواں دواں نظر آتے ہیں۔ یہ عالمی نمائشوں کا موسم ہے۔ ہر طرح کی عالمی نمائش اور فیشن شو توجہ کا مرکز رہتا ہے اور جب شہر میں سیاحوں کی بھرمار ہو ظاہر ہے ان کی خاطر مدارات کے لئے طرح طرح کی تفریح کا سامان دستیاب رہتا ہے۔ تھیٹر، شبینہ کلب، بار اور اوپیرا ہاؤس کی بزنس میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ میں دعویٰ نہیں کرتا کہ پورا پیرس دیکھ ڈالا مگر جتنا تھا جی بھر کر دیکھا۔ ویسے یہاں ساری زندگی قربان کر دی جائے تو بھی کچھ نہ کچھ رہ جائے گا۔ اب آخری خواہش صرف یہ تھی کہ یہاں کا مشہور اوپیرا ہاؤس دیکھ لوں اور ایک آدھ تھیٹر کا شو دیکھ لوں۔ آج میرے قیام کا آخری دن تھا۔ کل صبح مجھے پیرس کو خیر باد کہنا تھا۔ وعدے کے مطابق پالؔ اور دیاناؔ آج مجھے آخری بار ملنے آ رہے تھے۔ میں نے سارا دن ان کے ساتھ گزارنے کا وعدہ کیا تھا۔

صبح کے دس بجا چاہتے تھے اور میں رودی سین پر ان کا انتظار کر رہا تھا۔ سامنے فٹ پاتھ کے ایک دکان پر Go Go Club لکھا ہوا تھا۔ اس کی روشنی گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہی تھی۔ بار بار میری نظر سامنے جاتی اور یہ ''جا - جا کلب'' نہ جانے کیوں کھٹک رہا تھا۔ ٹھیک دس بج کر کچھ منٹ پر ایک چھوٹی سی لال ٹیوٹا آ کر رکی اور پالؔ نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ اندر دیاناؔ اور ایک نئے اجنبی بیٹھے تھے۔ میں بونژو کہتا ہوا پال کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی دوبارہ چل پڑی۔ پالؔ نے گفتگو شروع کی کہ کہاں پہلے چلا جائے۔ سب میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ تھیٹر دیکھنے کے موڈ میں ہوں اور خوش قسمتی سے میرے شہر ستمگر کلکتہ پر کچھ دکھایا جا رہا ہے۔ اور وہ ہے ''اوہ کلکتہ'' (Oh! Calcutta) میں اسے دیکھنا پسند کروں گا۔ گاڑی میں ہنسی کا فوارہ ابل پڑا۔ سب ہنس رہے تھے! معاملہ کیا ہے۔ پالؔ نے بتایا کہ اول تو اس شو میں کلکتہ کا کوئی ذکر نہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ ایک عریاں بالغوں کی کامیڈی ہے۔ ایک اور مزے کی بات یہ ہے کہ فرنچ میں اوکل کت تا'' سے مراد ہے ''اوہ یہ خوبصورت کولہے'' ساتھ ہی افسوس کی بات یہ ہے کہ اس شو کی ایڈوانس بکنگ مہینے بھر پہلے ہو جاتی ہے۔ ہاں اگر آپ پہلے دن کوشش کرتے تو آج تک کا ٹکٹ شاید مل جاتا۔ ''اوہ کلکتہ'' کی درگت سن کر منہ کا مزا کرکرا ہو گیا۔ میں بھلا کیسے کلکتے کو عریاں دیکھ سکتا تھا۔ اجنبی صاحب (جن کا نام پٹرک گل تھا اور پالؔ کے ساتھی تھے) نے بتایا کہ اس سلسلے کا ایک اور شو ''اوہ پاری'' (Oh! Paris) بھی چل رہا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو وہاں کوشش کی جائے۔ مگر میں ٹال گیا۔ دوسری تمنا اوپیرا ہاؤس دیکھنے کی تھی۔ پالؔ نے بتایا کہ یہاں دو اوپیرا ہیں۔ ایک Place D Opera اور دوسرا Opera Studio D Paris مگر پہلا بہتر ہے۔ گاڑی کا رخ بلوار گرانڈ کی طرف کیا گیا۔ تھوڑی دیر میں ہم لوگ ایک گنجان آبادی والے کاروباری مرکز میں آ گئے۔

سامنے ایک شاندار محل نما اوپیرا کی عمارت تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس کاروباری ماحول میں فنون لطیفہ کا گزر کیوں کر ہے مگر پتہ چلا کہ پہلے یہ علاقہ اتنا آباد نہیں تھا۔ ایک چورنگی تھی جس کے بیچ شاہی جاہ و جلال اور روایتی شان و شوکت لئے یہ اوپیرا اپنی تاریخ کو زندہ رکھے ہوئے تھا۔ اس کی زینت و زیبائش پر فراوانی سے خرچ کیا گیا تھا جو آج کے دور میں محال ہے۔ ہم باہر سے ہی اسے دیکھتے رہ گئے۔ اس کی سج دھج نئی نویلی دلہن سے کم نہ تھی۔ اس اوپیرا میں داخلے کا ٹکٹ الگ تھا اور پروگرام کا ٹکٹ الگ۔ دیانا نے ستر فرانک والے چار ٹکٹ لئے اور ہم اس عظیم الشان رنگ و

رامش کی دنیا میں داخل ہوئے۔ باہر جتنا دلکش تھا اندر اس سے کہیں زیادہ دلربا۔فنِ سنگ تراشی اور نقاشی کے لازوال نمونے قرینے سے ایستادہ تھے۔ ایسے مجسمے کہ بتوں پر ایمان لانے کو جی چاہ رہا تھا۔اندر کی رونق اپنے عروج پر تھی۔صحن میں نادر تصویروں کی نمائش اور ساتھ ہی خرید وفروخت جاری تھی۔صحن کے بیچ سے ایک سیڑھی اوپر جا رہی تھی۔اسے Grand Staircase کہتے ہیں۔سفید سنگ مرمر کی سیڑھیاں جس کے کنارے جالی میں سنگِ سلیمانی کی نقاشی کی ہوئی ہے۔یہ سیڑھیاں اوپر ایک ہال کو جاتی ہیں۔یہ ہال جگمگ کرتے منقش جھاڑ فانوس اور دیگر آویزاں سے مزین ہے۔ اس ہال کی چھت کو مارک شگال Marc Chagall مصور نے اپنے فن پاروں سے آراستہ کیا ہے۔ہم لوگ جب سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو دونوں جانب شاہی سپاہی نما گارڈ جنہیں Garde Republicaine کہتے ہیں اپنی یونیفارم میں چمکتے خورد اور آبدار تلواریں کھینچے استقبال کو کھڑے تھے۔ اوپیرا کے شائقین بھی طرح طرح کے لباس زیب تن کئے تھے اور سارا ماحول پرستان کی منظرکشی کر رہا تھا۔جگہ اور وسعت کے حساب سے یہ دنیا کا سب سے بڑا اوپیرا مانا جاتا ہے۔اس میں تماش بینوں کے لئے تقریباً بائیس سو (۲۲۰۰) نشستیں ہیں۔اس کا اسٹیج بھی اتنا زبردست ہے کہ ایک ہی وقت میں سوفنکار اپنے فن کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ہال میں ہلکی روشنی تھی۔ہم لوگ بالکنی میں تھے۔اشر نے ہمیں سیٹ بتائی اور ہم بیٹھ گئے۔پال شاید پہلے سے تیار تھے۔انہوں نے اشر کو کچھ ٹپ دیا۔معلوم ہوا کہ یہاں یہ دستور عام ہے خواہ سینما ہو یا اوپیرا کم سے کم بیس فرانک ٹپ لوگ دیتے ہی ہیں۔اسٹیج پر موسیقی کا پروگرام چل رہا تھا۔تقریباً ۲۵ موسیقار اپنے ساز سے جادو جگا رہے تھے۔ہم لوگ دیر سے پہنچے تھے۔پروگرام آدھے سے زیادہ ہو چکا تھا۔کوئی چالیس منٹ مختلف موسیقی اور فرنچ گانوں کا سلسلہ چلتا رہا۔اس کے بعد پروگرام ختم ہوا۔دوسرا شو دو گھنٹے بعد تھا۔ہم لوگ اسی ٹکٹ سے پھر دیکھ سکتے تھے۔مگر وقت کی کمی۔آدھا پروگرام دیکھ کر ہم لوگ باہر آ گئے۔ہال کے باہر آتے ہی ہم موسیقی بھول کر دوبارہ اس پرستان میں کھو گئے۔ ہم نے سوچا میوزک تو بہت جگہ مل جائے گی مگر یہ ماحول کہاں؟ پال اور دیانا نے ایک زبان ہو کر کہا کہ اس پروگرام سے تو ہم پورا لطف نہیں اٹھا سکے مگر اس کمی کو ہم لوگ ایک دوسرے شو میں پورا کر لیں گے۔پال کے دوست گل جلدی میں تھے انہوں نے اجازت چاہی اور رخصت ہو گئے۔

●●●

http://www.kitaabghar.com

آخری شب کے ہم سفر

دیآنا کے کہنے کے مطابق ہم پہلے ایک ثقافتی مندر جارج پومپیڈو George Pompidou دیکھنے کچھ دیر کے لئے رک گئے، یہاں داخلہ فری تھا۔ یہ پیرس کے جدید آرٹ اور کرافٹ کا مرکز ہے۔ یہ ماڈرن آرٹ کی طرح آڑی ترچھی اسٹیل کے پائپ میں اپنے ٹیکنیکل اور بجلی کے آلون کو نصب کئے ہے۔ پتہ چلا یہاں روزانہ تقریباً بیس ہزار لوگ آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ماڈرن آرٹ کا یہ سب سے بڑا مرکز ساری دنیا میں مانا جاتا ہے۔ یہاں صنعتی ڈیزائن، ریسرچ انسٹی ٹیوٹ برائے موسیقی اور ایک پبلک لائبریری ہے جس میں دس لاکھ کتابیں محفوظ ہیں۔ اس الٹرا ماڈرن ثقافتی مرکز میں بچوں کا بھی ایک خاص سیکشن ہے جہاں بڑوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ جب ہم لوگ سرسری طور پر یہ سب کچھ دیکھ کر باہر نکلے تو ایک طرف لوگوں کی بھیڑ نظر آئی۔ دیآنا نے اصرار کیا کہ جب ہم لوگ یہاں موجود ہیں تو یہ سڑک چھاپ ثقافتی پروگرام بھی دیکھتے چلیں۔ دور سے ہی موسیقی کی آواز آرہی تھی۔ جب ہم قریب پہنچے تو آنکھوں نے جو منظر دیکھا یقین نہ آیا۔ چار پانچ نہایت خوبصورت لڑکیاں، سڈول جسم اور چست بھڑک دار لباس میں مست، پورے سرور میں ناچ رہی تھیں یعنی :

پائل کی جھنکار رستے رستے

والا منظر تھا۔ ان کا ساتھ کچھ اس طرح کے لڑکے بھی دے رہے تھے۔ گروپ کے کچھ اور ممبر کنارے موسیقی کے ذریعہ اس ناچ کو دلکش بنائے ہوئے تھے۔ تقریباً سو ڈیڑھ سو کی بھیڑ سانس روکے، سحر زدہ اس ناچ میں گم تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنا بڑھیا شو کھلے آسمان کے نیچے راستہ پر کیوں ہو رہا ہے۔ پتہ چلا کہ یہ خانہ بدوش بنجاروں کی ٹولی ہے جو اسی طرح راگ رنگ سے اپنا پیٹ پالتی ہے۔ یہ لوگ ہو بہو بمبئی کی ہندی فلموں والے بنجارے جیسے تھے۔ بس گاتے فرنچ میں تھے کہ ''ہم بنجاروں کی بات مت پوچھو جی'' جو پیار کیا تو پیار کیا، جو نفرت کی تو نفرت کی..'' یہ لوگ جتنے خوبصورت تھے اتنا ہی صاف اور اچھا لباس زیب تن کئے ہوئے تھے۔ کچھ دیر ہم لوگ اس سحر انگیز رقص سے محظوظ ہوتے رہے پھر جانے کا خیال آیا۔

گاڑی ایک بار پھر سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ ہم لوگ روسالینیئر کی طرف جا رہے تھے۔ دیانا نے بتایا کہ ہم لوگ فولیز برزے...... Folies Bergere چلتے ہیں کیونکہ رات کے شو کے لئے ایڈوانس ٹکٹ لینا ہوگا۔ ۱۹۶۹ء میں ایک تھیٹر پیرس میں کھلا جس کا نام فولیز برزے تھا۔ دیآنا نے بتانا شروع کیا۔ ایک ڈپارٹمنٹ اسٹور والے جو بیڈنگ اور فرنیچر بناتے تھے انہوں نے قسمت آزمائی کے لئے یہ تھیٹر شروع کیا تھا۔ سال بھر کے اندر یہ میوزک ہال شرفا کی Get to gether کا مرکز بن گیا۔ ۱۹۰۲ تک یہ تھیٹر پیرس کے کلچر کا ایک سنگ میل بن گیا۔ یورپ کے چنیدہ فن کار اس میں حصہ لینے لگے۔ فرانس، مصر اور لبنان اور افریقہ کی خوبصورت ترین رقاصائیں اس کے اسٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتیں۔ ساتھ ہی ایک سے بڑھ کر ایک گلوکار اور کامیڈین بھی ساتھ ہوتے۔ اسی سال Mimic گروپ کا ایک نوجوان کامیڈین منظر عام پر آیا۔ ۱۴ سالہ اس لڑکے نے کامیڈی میں اپنا لوہا منوالیا اور پھر ساری دنیا اس کے آگے پیچھے تھی۔ وہ لڑکا کوئی اور نہیں مشہور کامیڈین اور سلور اسکرین کا لاجواب ایکٹر چارلی چپلن Charlie Chaplin تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا فولیز برزے کی شہرت میں اضافہ ہوتا گیا اور

اب ۱۹۷۴ء سے ہیلن مارٹینی اس کی قابل منیجر ہے اور آج رات کا شو بھی وہی کنڈکٹ کرے گی۔ اچانک گاڑی رکی اور پتہ چلا کہ ہم فولیز برزے پہنچ چکے ہیں۔ ہم لوگ اس تھیٹر میں داخل ہوئے جو باہر سے ایک سادہ سا مکان تھا۔ پال نے ایک سو بیس فرانک والے تین ٹکٹ لئے۔ پتہ چلا یہاں ۸۰ فرانک سے لے کر ۳۰۰ فرانک تک کا ٹکٹ ہے یعنی اب تک جو کچھ دیکھا یہ سب سے مہنگا شو تھا۔ ٹکٹ لے کر ہم باہر نکلے۔ دوپہر کے چار بج رہے تھے۔ دیانا نے مشورہ دیا کہ کسی کیفے میں کچھ دیر آرام سے کچھ کھا لیا جائے۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک کافی ہاؤس نظر آیا۔ ہم لوگ بغیر نام وغیرہ دیکھے اس میں داخل ہو گئے۔ پال نے کچھ کھانے کا آرڈر دیا...... بیٹھتے ہی دیانا نے پوچھا کہ یہ بتاؤ فرانسیسی ادب میں تم کس کو پسند کرتے ہو۔ میں نے بتایا کہ اسکول کے زمانے میں موپاساں میرا پسندیدہ مختصر افسانہ نویس رہا ہے۔ پھر ژیں پال سارتر کو خوب پڑھا، بیکٹ کے ڈرامے اور البرٹ کاموکی کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔ فرنچ حسن سے متاثر، فرنچ کھانے سے بیزار، فرنچ رقص سے محظوظ، فرنچ مہمان نوازی کا قائل اور فرنچ زبان سے پریشان، وقت ملا تو فرنچ ضرور سیکھوں گا اور کچھ، دونوں ہنسنے لگے میں نے دیانا سے پوچھا آپ کو ہندستانی کلچر کیسا لگا۔ Oh! I Love it اس نے فوراً کہا۔ تاج محل کو میں کبھی نہیں بھول سکتی، ہاں! ٹیگور کی گیتا نجلی بہت پسند ہے اور کے نارائن کے افسانے پسند ہیں۔ میں نے پوچھا اردو کے افسانوں کا ترجمہ کچھ پڑھا ہے۔ جس پر کچھ سوچتے ہوئے کہا کہ ہاں بلراج منرا کی کتاب The Alter پڑھی تھی اور بمبئی کے قیام کے دوران کچھ میگزین میں اردو نظموں کا ترجمہ پڑھا جسے پرتیش نندی نے ترجمہ کیا تھا۔ اتنے میں کافی اور سینڈوچ آ گئی اور ہم اپنی گفتگو چھوڑ کر کھانے میں لگ گئے کافی کی چسکیوں کے درمیان میں کیفے کا معائنہ کرنے لگا جو ایک چھوٹا مگر صاف ستھرا سا تھا۔ اچانک ایک پوسٹر پر میری نظر رک گئی۔ فرنچ میں اشتہار تھا یعنی Mime کے شہنشاہ Marcel Marceau مارسل مارسیو کا کوئی شو تھا۔ میں نے جلدی سے اس شو کے متعلق پوچھا۔ پتہ چلا اکیڈمی آف پنٹو مائم میں مارسل کا پروگرام ہے۔ میں مچل گیا کہ صاحب ہم تو یہ شو دیکھے بغیر پیرس سے نہیں ٹلتے۔ فوراً کافی ختم کی گئی۔ دیانا نے بل ادا کیا اور ہم لوگ رودی لیگ کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں ہم نے بتایا کہ مائم ہندستان میں اور خاص کر کلکتے میں بہت مقبول ہے اور تمہارے مارسل مارسیو نے ہمارے جوگیش دتا کو Father of Oriental Mime کا لقب دیا ہے۔ جوگیش ان دنوں کلکتہ میں اپنی اکیڈمی آف مائم چلا رہے ہیں۔ ایک اور فنکار حیدر آباد کا ہے جس کا نام ارشاد پنجتن ہے جو ان دنوں برلن میں مائم ورکشاپ چلا رہا ہے۔ اتفاق کہئے کہ اس دن مارسل کا شو خاص کر طالب علموں کے لئے تھا اس لئے ٹکٹ بہت کم تھا۔ شاید ۴۰ فرانک کا ٹکٹ لے کر ہم لوگ ہال میں داخل ہوئے۔ معلوم ہوا کہ اکیڈمی کا سالانہ شو ہے اور بہت سے نئے فن کار اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔ مگر افتتاح مارسل مارسیو کے مائم سے تھا۔ پروگرام شروع ہوا۔ فرنچ میں کچھ مارسل مارسیو کے بارے میں بتایا گیا۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ مارسل اسٹیج پر آئے۔ عمر کی پچاس سے کچھ اوپر کی منزلوں میں ہونے کے باوجود یہ فن کار چست اور ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ سب سے پہلے اس نے ایک منظر پیش کیا جس میں ایک نوجوان باغ میں ٹہل رہا ہے۔ پھر وہ ایک تتلی کا تعاقب کرتا ہے، تتلی کو پکڑتا ہے۔ تتلی کی پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ اس کا ارتعاش اور پھر وہ تتلی کو آزاد کر دیتا ہے۔ یہ میں لکھنے سے قاصر ہوں کیونکہ مائم سو فیصد Visual فن ہے جس میں زبان چپ رہتی ہے مگر فنکار کے جسم کا ایک ایک انگ بولتا ہے۔ خاص کر آنکھ اور چہرے کے تاثر سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ''کمپیوٹر مین'' مون واکنگ'' اور اس طرح کے دوسرے کئی خاکے پیش کئے گئے۔ کوئی چالیس منٹ تک مارسل مارسیو کا پروگرام چلا اس کے بعد وہ رخصت ہوئے اور ساتھ ہی ہم لوگ بھی اٹھ گئے کیونکہ ہم لوگوں کو فولیز برزے جانا تھا۔

وقت تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ مجھے کمرے میں آ کر فرینکفرٹ کے لئے تیاری کرنی تھی۔ پال اور دیانا کا بس چلتا تو آج ساری رات سڑکوں پر میرے ساتھ آوارگی کرتے مگر میں خود بہت تھکا ہوا تھا۔ ہم لوگ کچھ دیر کی ڈرائیو کے بعد فولیز برزے پہنچ گئے مگر ابھی شو میں کچھ دیر تھی

http://www.kitaabghar.com

۔تھوڑی دیر ہم نے یونہی چہل قدمی کی پھر کلچر کی بات کی۔ پسند ناپسند دہرایا'' ایک جگہ رک کر آخری کافی پی اور واپس تھیٹر آ گئے۔شو شروع ہونے میں پانچ منٹ باقی تھے۔اندر ہال روایتی طرز کا تھا۔ایک بہت بڑا اسٹیج مرکری لائٹ میں نہایا ہوا تھا۔اچانک تیز موسیقی کے ساتھ اسٹیج پر تقریباً پچاس حسینائیں نمودار ہو کر ایک روایتی رقص کا آغاز کرتی ہیں۔ان میں بیشتر مصری اور لبنان کی خوبصورت ترین لڑکیاں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔اس دلکش رقص کے بعد فرنچ گانوں کی باری تھی جس پر خوب واہ واہ ہو رہی تھی۔میں گانا سمجھنے سے قاصر تھا اس لئے حرکت دیکھ رہا تھا۔ساتھ ہی مسخروں کی ایک ٹولی ہنسا رہی تھی اور ایک جوان Mimicry پیش کر رہا تھا۔مجھے جو چیز بھائی وہ تھی آرٹسٹوں کی فراوانی۔ میرے خیال میں کچھ نہیں تو پانچ سو رقاصائیں اور مرد ڈانسر اس پروگرام میں حصہ لے رہے تھے۔آخر میں روایتی فرنچ کین کین'' رقص بے پناہ سراہا گیا۔یہ واقعی بہت اچھا تھا گو اس میں بیچ میں چند عریاں رقص بھی دکھائے گئے مگر فن اور آرٹ کی نظر سے میں اسے بیہودہ نہیں کہہ سکتا کیوں کہ ہمارے خالص مشرقی ماحول میں بھی اب کیبرے جیسے رقص کو عوام نے خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا ہے۔

پروگرام کے اختتام پر دل تھامے ہم لوگ باہر آئے۔ مجھے کچھ اور لوگوں کو فون کرنا تھا۔کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہوئی۔میں نے اپنے میزبانوں کو ہندستان آنے کی دعوت دی۔ پاؔل اور دیاؔنا پژمردہ صورت ہو رہے تھے۔کچھ ہی دیر میں ہم لوگ جدا ہونے والے تھے۔میرے پاس اپنے کرمفرماؤں کے لئے شکریہ کے الفاظ نہ تھے۔خاموشی سے ہم کار تک آئے اور گاڑی ایک بار پھر چل پڑی۔راستے میں صرف دیانا نے میرے اگلے پروگرام کے متعلق پوچھا۔ہوسٹل آ چکا تھا۔گاڑی رکی۔ہم لوگ باہر نکلے۔میں نے اپنے دوستوں سے اجازت چاہی۔گو دل نہیں مان رہا تھا۔دیانا اور پال نے بھیگی پلکوں سے ہمیں الوداع کہا۔میں خاموش تھا۔دل کی دھڑکنوں سے یہ آوازیں آ رہی تھیں :

وقت رخصت وہ چپ رہے عابدؔ
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

•••

http://www.kitaabghar.com

فرینکفرٹ کی بات ہے پیارے

میرے ایک شناسا جرمنی گئے تو ایک عدد خالص جرمن وائف ساتھ لیتے آئے، بیگم شاید فرینکفرٹ کی تھیں۔ وہ جب بھی کچھ سناتے تو کہتے ''پیارے بس جرمنی میں کوئی جگہ ہے تو فرینکفرٹ، کیا بات ہے اس شہر کی''۔ خوب لن ترانی ہانکتے۔ انہیں کیا معلوم کہ ان کا پیارا بھی آوارگی کے لئے ہانکتا ہنکاتا فرینکفرٹ پہنچ ہی جائے گا۔ انہیں کیا خود پیارے کو بھی اس کا اندازہ نہ تھا۔ آج اس واقعے کو پندرہ سال ہو گئے اور فی الحال میں فرینکفرٹ ایئر پورٹ پر اس شناسا کے سسرال کا پتہ اپنی خستہ ڈائری میں ڈھونڈ رہا ہوں۔ باہر موسم کا موڈ خراب ہے۔ جھم جھم بارش اور طوفانی ہوائیں سائیں سائیں چل رہی ہیں۔ تمام مسافر موسم کے خوشگوار ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ بجلی کی کڑک اور طوفان کا زور تاریخ کے اس دور کی یاد تازہ کر رہا ہے جب یہاں ہٹلر کی حکومت تھی۔ اس ملک میں پروشیا کے جاہ و جلال والے شہنشاہوں کا دور دورہ تھا۔ قصر ولیم، شاہ فریڈرک، پرنس بسمارک اور ہٹلر اعظم جس سے زمین کانپتی تھی۔ جس کے ابروؤں کے خم سے لاکھوں مجبور عوام گیس چیمبر Gas Chamber میں چند منٹوں میں لقمۂ اجل ہو جاتے تھے۔ سوستیکا کے پرچم تلے گسٹاپو اور نازیوں کی حشر سامانیاں کروڑوں انسانوں کی تقدیر سے مذاق کرتی تھیں۔

آج یہ ملک ظلمت کو چیر کر روشنی کا مرکز بنا ہوا ہے۔ خوش باش، خوش نہاد لوگوں کا ملک ہے۔ اب جنگ کی گھن گرج کی جگہ بیتھوون کی سریلی دھنیں اور تانیں سنائی دیتی ہیں مگر موسیقارِ اعظم بیتھوون کی دھن کے ساتھ فی الوقت دوسرے دھن بھی ساتھ دے رہے ہیں اور وہ میرے دانتوں کا کٹکٹانا۔ سردی بڑھتی جا رہی ہے میں جتنا زادِ راہ لے کر چلا تھا اپنے اوپر لا دلیا ہے مگر دانت ہیں کہ بجے جا رہے ہیں۔ ستمبر کے آخری ایام ہیں۔ پتہ نہیں بارش کی یہ کیا تک ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ موسم سرما کے شباب کا اعلان ہو۔ مجھے چھوڑ کر تمام مسافر بڑے آرام سے موسم کی ستم ظریفی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ لاؤنج میں کافی گہما گہمی ہے۔ ایئر پورٹ کے کیفے پوری طرح سروس میں مگن ہیں۔ کوئی گرم کافی، کوئی وہسکی تو کوئی صرف بیئر سے شغل کر رہا ہے۔ میں نے اب ذہن سے تاریخ کا البم بند کر دیا تھا۔ نہ مجھے کسی کا انتظار تھا نہ مجھے کوئی لینے آ رہا تھا اور نہ ہی میں نے اب تک بیگیج کلیم سے سامان وصول کیا تھا۔ بس بے فکری کے ساتھ لابی میں ٹہل رہا تھا۔ اچانک خیال آیا کہ بیکار مباش کچھ کیا کر۔ کافی شاپ سے ایک گرم کافی خریدی اور سامنے انفارمیشن کاؤنٹر پر جا لگا اور بڑے آرام سے بونژو کہا، توبہ ہے فرنچ کا بھوت اب تک سوار تھا۔ میاں اب آپ فرینکفرٹ پہنچ چکے ہیں۔ ہوش میں آیئے اور جرمن کی ڈائری نکالئے۔ اپنی خفت مٹانے کے لئے میں نے جلدی سے ہلو کہا۔ شکر ہے جواب بھی ہلو تھا۔ کون کہتا ہے جرمن خوبصورت نہیں ہوتے، بھئی خوب ہوتے ہیں۔ ہاں فرنچ کی طرح نازک انداز نہیں ہوتے بلکہ ضرورت سے کچھ زیادہ صحت مند ہوتے ہیں۔ ہندستانی ذہن بھی کیسی کیسی بھول بھلیوں میں بھٹک جاتا ہے۔ خیر ابھی چونکہ German made easy کتاب پاس نہ تھی اس لئے میں نے انگلش میں گفتگو شروع کی۔ محترمہ میری ہی طرح باتونی تھیں اور شاید کافی دیر سے خاموش بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی چہکنے لگیں۔ پہلے تو مجھے خوش فہمی ہوئی جس میں ہر دیسی مبتلا ہو جاتا ہے۔ پھر کچھ ہی دیر میں اندازہ ہوا کہ یہ تبسم اور یہ تکلم محترمہ کی عادت نہیں بلکہ پیشے میں شامل ہے۔ اپنے پیشے سے اتنی محبت اور ایمانداری پہلی بار دیکھی۔ محترمہ معلومات کی پٹاری تھیں۔ میں نے موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کیلئے انہیں ایک عدد فرنچ سگریٹ بڑھایا۔ اپنا تعارفی کارڈ بطور آوارہ گرد بتایا اور قلم کاغذ سنبھالا، کسی زمانے میں بندہ اسٹینو گرافر بھی رہ چکا ہے۔ میں نے آموختہ دہرانا اور نوٹ کرنا شروع کیا جو کچھ میں نے غلط صحیح قلم بند کیا، بقول اس سنجیدہ، حمیدہ و فہمیدہ محترمہ کے کچھ اس طرح ہے۔ فرینکفرٹ ایئر پورٹ ہر جائز (کبھی کبھی ناجائز) پرواز کی

خواہش کا احترام اور استقبال کرتا ہے۔ اسے جٹ سٹی بھی کہتے ہیں۔ یہ دنیا کا مصروف ترین ہوائی اڈہ ہے۔ نیویارک کے J.F.K کے بعد! مسافر بردار طیارے تقریباً ۴۹۰۰ پروازیں ہر ہفتہ دنیا کے ۱۹۰ شہروں کے لئے کرتے ہیں۔ یہ سہولت کوئی ۷۰ مختلف ہوائی کمپنیاں فراہم کرتی ہیں اور سالانہ تقریباً ۳۰۰ طیارے چارٹر کئے جاتے ہیں۔ شاید ہی کوئی مسافر اس ایئرپورٹ سے مایوس لوٹتا ہے۔ موسم گرما میں روزانہ یہاں تقریباً پچپن ہزار مسافر اترتے ہیں اور پرواز کرتے ہیں۔ مسافروں کے علاوہ مال برداری میں بھی یہ ہوائی اڈہ دنیا کا مصروف ترین ہوائی اڈہ ہے۔ یہاں کے پسنجر ٹرمینل کو جمبو اسٹیشن کہتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں ۲۶ ہوائی جہاز جن میں جٹ بھی شامل ہیں ہینڈل کئے جاتے ہیں۔

یہاں ایسی سرنگیں بنی ہوئی ہیں کہ مسافر طیارہ سے نکل کر سیدھا زمین دوز ریل تک پہنچ سکتا ہے۔ عمارت کے اندر تقریباً سو دکانیں ہر طرح کی اشیاء ضروریاتِ زندگی فروخت کرتی نظر آتی ہیں۔ درجنوں کیفے اور ریستوراں جرمن برگر بیچنے میں مصروف ہیں۔ اس عمارت میں تین سینما گھر اور ایک ڈسکو جدید رقص گاہ اور ایک دندان ساز کی دکان بھی ہے۔ غرض یہ ہوائی اڈہ بذات خود ایک چھوٹا موٹا سجا سجایا شہر ہے۔

فرینکفرٹ ایئرپورٹ دنیا کے چند جدید ترین ہوائی اڈوں میں شمار کیا جاتا ہے جہاں صرف ۴۵ منٹ کی قلیل مدت میں مسافر اپنا پروگرام بدل کر دوسری پرواز پکڑ سکتا ہے۔ مال برداری اور سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے کمپیوٹر کنٹرول کا سہارا لیا جاتا ہے۔ زمین دوز ٹرانسپورٹ کی سہولت کوئی چالیس ہزار میٹر لمبی جال کی شکل میں پھیلی ہوئی ہیں۔ میں بڑی تیزی سے کام کی باتیں نوٹ کر رہا تھا اور محترمہ بڑی خندہ پیشانی سے مشینی انداز میں انفارمیٹیو کمپیوٹر بنی ہوئی تھیں۔ بیچ میں آنے جانے والوں سے بڑے ناز سے ہلو اور ہائے بھی فرما رہی تھیں۔

اسی وقفے میں دو ایک مسافر کچھ پوچھ لیتے اور محترمہ بڑے انداز سے کہتیں ''ناخ ریشش'' Nach Rachts اور ہاتھ کا اشارہ ہوتا داہنی طرف اور کبھی کبھی باتوں کے درمیان کوئی سوالی آتا تو کہہ دیتیں ''ناخ لینک'' Nach Links اور ہاتھ کا اشارہ ہوتا بائیں طرف۔ جواب میں ہر شخص مسکرا کر کہتا ''دانکے شرن''۔ یہ عمل ہم لوگوں کی گفتگو کے دوران کئی مرتبہ دہرایا گیا اور اب مجھے سمجھنے میں دیر نہیں ہوئی کہ مسافر مختلف جگہوں یا مقام کے بارے میں اس انفارمیشن کاؤنٹر سے پوچھ رہے ہیں اور جواب میں دائیں اور بائیں بتا دیا جاتا ہے اور مسافر شکریہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں اور بھی ایک لفظ سنائی دیا اور وہ تھا ''بی تے'' Bitte یعنی برائے کرم، چلئے صاحب اللہ اس معلوماتی حسینہ کا بھلا کرے کہ جرمن کے چند کارآمد الفاظ میری جھولی میں آئے۔ ایک بات مجھے یہاں بھی کھٹک رہی تھی کہ عام بول چال میں لوگ انگلش کو بالکل خاطر میں نہیں لا رہے تھے۔ یعنی فرنچ حضرات کی طرح جرمن کو بھی انگریزی سے بیر تھا۔

●●●

گوئٹے دی گریٹ کا عظیم شہر ''ف''

صبح فون کی گھنٹی سے آنکھ کھلی —ہلو— دوسری طرف سے کوئی صاحب جرمن زبان کی خوبیاں بیان کر رہے تھے۔ میں نے گلا صاف کرتے ہوئے بتایا کہ بھیا جو کہنا ہے انگلش میں کہو، میں تو دیسی بنجارہ ہوں۔ بات میری طرح بھیا بھی نہیں سمجھے اور لائن کٹ گئی۔ معاملہ میں کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔ فون ضرور ریسپشن سے کیا گیا تھا یہ بتانے کے لئے کہ ''ارے جاگ زمانہ جاگا'' میں نے تکیہ کے نیچے سے گھڑی نکالی۔ صبح کے آٹھ بجا چاہتے تھے۔ کم بخت کچھ دیر اور سونے دیا ہوتا۔ ہم اس وقت تو کلکتے میں سو کر اٹھتے ہیں۔ پھر فرینکفرٹ اور کلکتے میں فرق ہی کیا رہا۔ خیر اب اٹھ گئے تو تیار ہونا ہی پڑے گا۔

رات کی باتیں آہستہ آہستہ ذہن میں آ رہی تھیں۔ کل رات نو بجے میں فرینکفرٹ پہنچا تھا۔ بارش اور موسم کی خرابی کی بنا پر Y.M.C.A نہیں جا سکا مگر خوش قسمتی سے ایئر پورٹ سے کچھ ہی فاصلے پر یوتھ ہاسٹل مل گیا۔ بس میرے قیام کا مسئلہ حل ویسے بھی میرے پاس اس شہر مفتوں کے لئے فقط تین دن تھے۔ گرچہ تین دنوں میں تو بیتھوون کی ''سا-رے-گا-ما'' کو کیا خاک سمجھ پاؤں گا۔ یا پھر گوئٹے Goethe کے فن پاروں سے کیا آنکھیں ٹھنڈی کروں گا مگر مجبوری کا نام سفر ہے اور آدمی جب سفر میں ہوتا ہے تو عام خواہش پوری نہیں ہوتی۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے والا معاملہ تھا۔ میں نے کھڑکی کھولی۔ فضا صاف تھی مگر سردی کا احساس ہوا، میں نے برش کرتے ہوئے فوراً ارادہ بدلا۔ آج غسل میں نہیں کروں گا، ابھی کل ہی غسل کیا ہے اور مسلمان ویسے بھی جمعہ کے جمعہ نہاتا ہے اور آخر مجھے واپس تو اسی گلی چونا والی میں جانا ہے جہاں لگانے کو چونا مل جاتا ہے مگر نہانے کو پانی نہیں۔ اگر یونہی عادتیں خراب ہوئیں تو مکان مالک سے اور کبھی کبھار مالکہ سے بھی لڑائی رکھی ہے۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ نہانا ملتوی کر دیا جائے۔ ضروریات نے مجھ سے فارغ ہو کر مجھے لباس تبدیل کرنے کے قابل بنایا اور میں کوئی جرمن دھن گنگناتا نیچے آیا۔ دنیا رواں دواں تھی۔

فرینکفرٹ خالص تجارتی شہر ہے لیکن یہاں جدید او قدیم کا امتزاج نمایاں ہے۔ میں نے رک کر ایک طائرانہ نظر سامنے دوڑائی۔ ایسا لگا کہ اس شہر میں صرف کلیسا کی بھرمار ہے۔ یہاں کے گرجا گھروں کی عظمت پیرس سے کسی طرح کم نہ تھی۔ میں چہل قدمی کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ فلک بوس عمارتیں ساتھ ساتھ پرانے طرز کے مکانات، ایسا لگ رہا تھا کہ ہر پرانے مکان کو منہدم کرنے کی بجائے اس کے بغل میں ایک فلک بوس عمارت کھڑی کر دی گئی ہے۔ یہ شہر نہ صرف دنیا کا سب سے مصروف ترین تجارتی مرکز ہے بلکہ علوم، فنونِ لطیفہ اور ثقافتی قدروں کا حامل ہے۔

دریائے میں Main نے اس شہر کو چھوٹے اور بڑے ٹکڑوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک حصہ جنوب میں ہے جسے Sachseunausen کہتے ہیں۔ یہ علاقہ اپنی مہمان نوازی اور پکوان کے لئے مشہور ہے۔ مین کے ساحل کے دونوں جانب ہرے بھرے نظر آئے۔ شہر کے بیچ بہتے ہوئے اس دریا پر تھوڑے فاصلے پر پل بنے ہیں جو دونوں جانب پیدل اور سوار کی آمد و رفت کے لئے ہیں۔ ویسے یہ علاقہ سیاحوں کی زبان میں Ebbelwei Quarter یعنی ''سیب کی شراب کا خطہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ ساتھ ہی یہاں ایک میوزیم ہے جو ٹھیک مین کے ساحل پر آباد ہے۔ اس شہر کو قریب سے دیکھنا ہو تو اسے پیدل گھوم کر دیکھا جائے، میں گرچہ پیدل ہی گھوم رہا تھا مگر وقت کی تنگی سے پریشان تھا۔ تقریباً پورے

یورپ میں راستوں کے کنارے کیفے اور ریستوران کا رواج ہے۔ یہاں بھی مختلف دکانوں کے ساتھ ہر وضع کے کیفے آباد تھے اور ہر خاص و عام صبح ہی سے بڑے بڑے شیشے کے جگ میں بیئر کی چسکیاں لیتا نظر آ رہا تھا۔ میں جس راستے پر محو خرام تھا اس کا نام کچھ پلیئر سٹراس تھا۔ جرمن میں سٹراس کا مطلب ہوتا ہے راستہ یعنی ہر نام کے آخر میں سٹراس لگا ہوتا ہے۔ جس طرح پیرس میں ہر راستے کے نام کے آخر میں بلوار لگا ہوتا ہے جیسے دہلی میں ہر چوراہا فلاں مارگ اور کلکتے میں سرانی، مگر لفظ سٹراس کچھ منہ کا مزہ کرکرا کر رہا تھا مگر میں کون ہوتا ہوں دخل دینے والا۔ ہاں تو میں پوچھتے اور قدم پھونکتے فرینکفرٹ کے عظیم سپوت اور جرمنی کے سب سے مقبول شاعر ''گوئٹے'' Goethe کے مکان تک بن بلائے پہنچ گیا۔ میں نے پہلی حاضری اگربتی کے ساتھ اس عظیم شاعر کی چوکھٹ پر دی۔

گوئٹے فرینکفرٹ میں پیدا ہوا تھا اور زندگی کے بیش قیمت ایام یہاں گزارے تھے۔ یہ مکان دوسری جنگ عظیم میں متاثر ہوا تھا مگر بعد میں اسے پوری طرح بچالیا گیا۔ مجھے اس مکان کی سادگی اور خصوصاً جرمن عوام کی سادہ دلی بہت پسند آئی۔ اس مکان کو بالکل اسی طرز پر جیسے گوئٹے نے استعمال کیا تھا رکھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ روزمرہ کے ساماں پرانے فرنیچر، کھانے کی میز۔ پرانی ڈنر سٹ، چھری کانٹے، چائے کی کیتلی اور وہ چولہا بھی اب تک وہیں سلیقے سے رکھا ہے جہاں استعمال کیا گیا تھا۔ مسہری اور ریشمی پردے تک اس دور کے نفیس فیشن کی عکاسی کرتے ہیں۔

اس ذاتی مکان کے ساتھ ایک چھوٹا موٹا عجائب گھر بھی ہے جسے ''گوئٹے میوزیم'' کہتے ہیں۔ اس میں ایک بڑا ہال کتابوں کے لئے مخصوص ہے۔ تقریباً ایک لاکھ کتابیں ادب، ثقافت اور سائنس پر یہاں سجی ہوئی ہیں۔ اسی کتب خانے میں ایک کتاب توجہ کا مرکز بنی رہتی ہے اور وہ ہے لغات ٹھگ ۱۹۶۱ ''Dictionary of Frauds 1961'' کتابوں کے علاوہ قدیم قلمی نسخے اور مسودے اور دلکش مجسمے جو گوئٹے کے دور کی زندہ تصویر پیش کرتے ہیں۔

یہاں سے فارغ ہو کر میں چلا تو سامنے ایک ''کباڑی بازار'' نظر آیا۔ ایسے بازار اب پورے یورپ میں فیشن میں شامل ہیں۔ اسے دیکھنے کی خواہش اس لئے نہ ہوئی کیونکہ یہ ہمارے کلکتے کے ملک بازار یا چور بازار سے زیادہ سودمند نہ ہوگا۔ موسم کا موڈ خراب ہو رہا تھا۔ کوئی ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ صبح میں نے بھرپور ناشتہ نہیں کیا تھا اس لئے ایک چھوٹے سے کیفے میں داخل ہوا اور Cheese Burger یعنی پنیر کے سخت ٹکڑے ایک بڑی سی ڈبل روٹی پر کچھ سلاد کے ساتھ سجا کر پیش کرنے کو کہا۔ جرمن کھانے میں Hamburger کو بڑا مقام حاصل ہے۔ اس کی برکت سے سیکڑوں برگر نے جنم لے لیا تھا اور ہر شخص ایک الگ سا برگر بیچ رہا تھا بالکل اسی طرح جیسے ہر فرقے کا مسلمان اپنی ایک الگ سی مسجد بنا لیتا ہے۔ اس کے ساتھ چائے کا آرڈر دیا۔ ان دنوں جرمن چائے سے خوب دل لگا رہے ہیں اور خاص طور پر دارجلنگ اور آسامی ہندستانی چائے کی مانگ بہت زیادہ ہے۔ ساتھ ہی چین کی چائے بھی مقبول ہے، گرچہ دنیا میں جرمن کبھی بھی چائے کے رسیا نہیں تھے مگر اب حالات بدل گئے ہیں۔

جرمن کی روزمرہ زندگی میں Tee Cuppa یعنی چائے کا کپ ایک خاص کشش رکھتا ہے۔ اب تو پردے سے پردہ اٹھ رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ کوئی ۱۲۰ ذائقے اور رنگ کی چائے یہاں دستیاب ہے۔ چند مقبول و معروف نام یہ ہیں۔

Mango Tea, Passion Fruit Tea, Rum Tea, Lemon Tea, Apricot Tea, Cardamom Tea.

صرف بڑے ہی نہیں بلکہ اسکول کے بچے، بوڑھے اور عورتیں بھی چائے کی دیوانی ہیں۔ چائے یہاں بہت مہنگی ہے۔ تقریباً دو سو روپئے سے تین سو روپئے کیلو اور ایک کپ کم از کم بارہ روپئے کی۔ میں چائے اور چیز برگر سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی مگر لوگ راستے پر چل رہے تھے۔ جرمن تندرست اور محنت کش قوم ہیں اس لئے بارش میں انہیں سردی نہیں ہوتی۔

میں بندس بنک سٹراس پر گھوم رہا تھا۔ یہ پورا کاروباری علاقہ تھا۔ بلند وبالا جدید طرز کی عمارتوں کا سلسلہ ہر سو پھیلا ہوا تھا۔ سامنے فرینکفرٹ اسٹاک ایکسچینج کی عمارت تھی۔ یہ جرمنی کی سب سے مصروف اور بڑی سپر مارکٹ ہے۔ فرینکفرٹ میں پورے بارہ مہینے کوئی نہ کوئی عالمی نمائش اور کانفرنس ہوتی رہتی ہے۔ میری ذراسی چوک اور بدقسمتی سے عالمی کتابوں کی نمائش اور عالمی موٹر شو صرف تین دن پہلے ختم ہوئی تھی جس کا مجھے افسوس تھا۔ اب میں شہر کے قلب میں پہنچ چکا تھا۔ یہاں کا Telecommunication بھی قابل دید ہے۔ فی الحال یہ ٹیلی فون بھون تین لاکھ ڈائرکٹ ڈائل کال کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ فرینکفرٹ کی فون سروس پورے جرمنی میں سب سے ایڈوانس ہے۔ اس شہر سے دنیا کے ۱۱۲ شہروں میں ڈائرکٹ فون ملایا جاسکتا ہے۔ یہ ترقی بہت پرانی نہیں۔ صرف دس سال پہلے فرینکفرٹ سے صرف ۴۶ ملکوں کا رابطہ تھا۔ اب ساری دنیا ان کی انگلی پر گھوم رہی ہے۔ ایک ہم اور ہماری حکومت ہے۔ پچھلے دس سالوں سے حالت ناگفتہ بہ ہے۔ ان دس برسوں میں منسٹر حضرات نے یہی کہتے گزارا ''آپ کا فون تشفی بخش نہیں تو لائن کٹوا دیں''۔ ارے تسلی بخش تو منسٹر بھی نہیں مگر انہیں بھی تو فون کی طرح جھیل رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ فرینکفرٹ جرمنی کی راجدھانی ہوتے ہوتے رہ گیا تھا مگر اس سے اس کی قدرومنزلت میں کسی طرح کی کمی نہیں۔ اٹھارہویں صدی کے نصف سے ہی یہ شہر تجارت کا مرکز رہا ہے۔ تجارتی معاملے میں ایک بات قابل غور ہے کہ فرینکفرٹ آج کل دنیا کے مال گزاری اور بینکنگ Banking میں سرفہرست ہے۔ یہاں تقریباً چار سو عالمی بینک اور ساتھ میں ملکی بینک سرگرم عمل ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ یہ رہا کہ جرمن واقعی محنت کش اور ایماندار ہوتے ہیں۔ مشینی زندگی اور بہتر مستقبل کی بھاگ دوڑ کے پیچھے ان میں ایک طرح سکون اور قناعت ہے۔ ہوسکتا ہے یہ عارضی ہو مگر کیا ہمیں یہ عارضی سکون وقناعت بھی حاصل ہے؟

●●●

http://www.kitaabghar.com
urdukutabkhanapk.blogspot.com

گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو!

ابن بطوطہ اور ہیون سانگ کا نام تاریخ کے نصاب میں پڑھا ضرور تھا کیونکہ امتحان پاس کرنا تھا مگر دل پر اس کا نقش شاید پڑا ہی نہیں۔ ہاں منشی محبوب عالم ''اڈیٹر پیشہ اخبار'' کا نام دھند میں لپٹی یادیں تازہ کر دیتا ہے۔ محبوب عالم منشی تھے یا نہیں اچھی طرح معلوم نہیں ہاں مجھ سے بڑھ کر آوارہ گرد تھے۔ اپنے ۱۹۰۰ء کے سفر نامے میں مغرب کی ترقیوں، میڈیکل سائنس اور ٹکنالوجی کا عروج دیکھ کر ان کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ خیر میں نے جو کمپیوٹر کی ترقی دیکھی تو بس دیکھ لی، کوئی حسد اور حیرانی ہوئی ہی نہیں۔ ہم اپنے ہم وطنوں سے مایوس نہیں ہیں مگر کیا کریں :

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی سے گلہ کرے کوئی

ہم خود تاویل کے سوا کیا کر رہے ہیں۔ منشی محبوب عالم جب سفر سے لوٹے تو اپنے کلاسیکی طرز تعلیم پر خوب خوب نکتہ چینیاں کیں مگر وہ نکتے ان کے سفرنامے میں دیمک کی غذائے خوش مزہ بن رہے ہیں۔ کاش وہ اپنے دور کی تعلیم کو آج کی سندوں اور ڈگریوں سے ملاتے، بیچارے قدرتی موت کی بجائے ہارٹ اٹیک سے جاں بحق ہوتے۔ اپنے سفرنامے میں برلن کے ٹیکنیکل ہائی اسکول کے بارے میں جواب یونیورسٹی بن چکا ہے، فرماتے ہیں ''جس چیز نے جرمنی کو بڑی شہرت دی ہے، وہ یہاں کا پالی ٹکنی گم ہے۔'' یہ مدرسہ سوا ایک سو سال سے جاری ہے۔ میں مسلسل سوا پانچ گھنٹے اس عالی شان تعلیم گاہ کی مختلف منزلوں اور درجوں کا طواف کرتا رہا مگر نصف بھی نہ دیکھ سکا۔ آرگینک اور ان آرگینک کیمسٹری کے تجربے دیکھے۔ آج کل یورپ کے ہزاروں طالب علم یہاں تعلیم پاتے ہیں۔ ایک عجائب خانہ میں ہر قسم کی مشینوں کے چھوٹے نمونے طالب علموں کو سمجھانے کے لئے رکھے ہیں لیکن دوسری جگہ ایک مکان میں مشینوں کے ہر پرزہ کے مختلف عمل اس کے مختلف حصوں سے دکھائے گئے ہیں۔ عمارات اور پلوں کے ماڈل، دخانی جہازوں کے نمونے، نقشہ کشی اور لکچر روم، جرمنوں کا یہ کہنا ذرا بھی بے جا نہیں کہ اتنا بڑا مدرسہ اس فن کا دنیا میں کوئی دوسرا نہیں۔

مسلمان بڑے فخر سے یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی میں بیک وقت دس ہزار طالب علم پڑھتے ہیں اور مراکو کے فیض دارالعلوم میں بھی کئی ہزار طالب علم پڑھتے ہیں مگر جن علوم کو الازہر اور فیض میں پڑھایا جاتا ہے وہ اب بوسیدہ ہڈیاں ہو چکی ہیں!

ذرا امریکہ کی مشہور بک یونیورسٹی کی رصدگاہ سے یا گرینچ کی رصدگاہ سے موازنہ کرو تو معلوم ہوگا کہ وہ فرضی علم ہیئت صحیح ہے یا عظیم الشان دوربینوں سے ستاروں کا عینی مشاہدہ! جو لوگ اس قسم کے موازنے کو پسند نہیں کرتے وہ مجھے معاف کریں۔ آج اس تحریر کو وجود میں آئے ۸۲ سال ہو گئے مگر قوم ان لطیف سروں میں گم ہے جس تال پر منشی محبوب عالم چھوڑ گئے تھے۔ منشی صاحب کی تحریر سے ایک اور آوارہ اکبر حضرت ابن انشاء اتنے متاثر ہوئے کہ مستی چھوڑ سنجیدگی پر اتر آئے — کہتے ہیں ''سچ پوچھئے تو آج کل ہمارا ایمان بھی ڈانوا ڈول ہو رہا ہے۔ کچھ دن پہلے تک ہمارا خیال تھا کہ ہمیں سچا مسلمان بننا چاہئے اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب ہمارا خیال ہے کہ سچے مسلمان بننے کے علاوہ بھی بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ قوم کو صنعتی تعلیم دینی ہوگی، کارخانے بنانے ہوں گے۔ اجتماعی فارموں میں ٹریکٹروں اور مشینوں سے کاشت کر کے پیداوار بڑھانی پڑے گی تاکہ ملک کی معیشت مستحکم ہو۔ سب اچھا کھائیں پئیں۔ ٹیلی ویژن جناب شیخ ہی کے گھر میں کیوں ہو مرید سادہ کے گھر میں کیوں نہ ہو۔ یہ لوگ جو آج کل پڑھ لکھ کر کلرک اور چپراسی کی نوکری کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں کل میکنک اور خرادیئے ہوں گے تو اپنی خودی کو بھی بلند کر سکیں گے۔ میرے آپ کے

محتاج نہ ہوں گے جب آپ کے کھیت آباد، کارخانے رواں، خزانے بھرے اور لوگ خوش باش ہوں گے تو کیا مجال ہے کہ کوئی ہمسایہ یا غیر ہمسایہ ٹیڑھی نظروں سے آپ کو دیکھ سکے۔ اس وقت سچے مسلمان بننے کا مزہ بھی کچھ اور ہوگا۔

صاحبو! اوروں کو کیا کہیں، ہم نے بھی ساری عمر شاعری ہی کی، دوسروں کی شاعری پر ''واہ واہ'' اور مکرّر ارشاد'' میں عمر گزاری، کیا کریں ہماری تعلیم ہی سوداؔ اور میرؔ کے کلام سے شروع ہوئی، چھٹی جماعت میں اردو کے کورس میں میر تھے۔ خواجہ میر دردؔ اور آتشؔ تھے، سوز وگداز تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے ماسٹر گورو دیال سنگھ تھوڑی سائنس بھی پڑھا دیا کرتے تھے جس سے کچھ تصورِ ایصالِ حرارت اور قوتِ انابیتِ شعری اور حیاتین وغیرہ کا اب تک علم ہے اور یہ معلوم ہے کہ فارن ہائیٹ کیا ہوتا ہے۔ ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے، مکتب میں پڑھتے تو جھوم جھوم کر پڑھنا اور شام کو روٹیاں مانگ کر لانا، چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر لڑنا، مین میخ نکالنا اور اس بات سے غافل رہنا کہ دنیا کہاں سے پہنچ گئی ہے۔ فضا میں کیا ہو رہا ہے۔ خلا میں کیا ہو سکتا ہے۔ علم الکلام کے رموز تو استاد نے ہمیں پڑھا دیئے، جابر بن حیان کا نام نہ بتایا۔

جب کپلر اور گلیلیو آسمان میں تھگلی لگا رہے تھے ہم شاعری کر رہے تھے جب واٹ اور اسٹیفنسن بھاپ کو غلام بنا رہے تھے نصیر شاہ دہلوی کی کوشش تھی کہ کوئی قافیہ بندھنے سے نہ رہ جائے۔ جب ایڈیسن اور مارکونی برق اور آواز کے دیوؤں کو اسیر کر رہے تھے ہم شعری گلدستہ فتنہ اور عطر فتنہ نکال رہے تھے، جب رائٹ برادران کلوں سے ہوا میں اڑ رہے تھے ہم اور رجب علی بیگ سرور لفظوں کا طوطا مینا بنا رہے تھے۔ ہر مصرعہ سے تاریخ نکال رہے تھے اور جب امریکہ اور روس نے آسمان کے لئے نئے چاند اور ستارے بنا لئے، ہم پرانے اختر شناس اب بھی جنتریوں اور فال ناموں میں اپنی قسمت کا حال دیکھ رہے تھے۔ عباسیوں کے عہد کو کتنی صدیاں گزر گئیں۔ جاگو اور دیکھو کہ اب کس بادشاہ کی بادشاہی ہے۔ بیچ میں قصیدہ گو، واسوخت گو، قافیہ پیما، منشی احمد حسین قمر، اور منشی محمد حسین جاہؔ تو ضرور ملیں گے لیکن مسلمانوں میں کوئی کوپرٹیکس، واٹ، ایڈیسن اور مارکونی نہ ملے گا۔ جس نے کی شاعری کی، مشاعرہ برپا کیا، گلدستۂ سخن نکالا یا پھر نئے فرقے پیدا کیے۔ مقلد اور غیر مقلد کی بحثیں چلی، جماعتی تنازع اور ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں کھڑی کیں۔ آمین بالجہر پر فساد ہوئے، ذبیحے اور رویت ہلال پر آ کر سفینہ کنارے لگا۔ یارو کیا ہیں یہ قصے جن کو سینے سے لگائے پھرتے ہو—— فارس کے شہزادوں کی کہانیاں، جان عالم اور بدر منیر کو کب تک روؤ گے—— میرؔ کی :

بے زری کا نہ کر گلہ غافل
رکھ تسلی کی یوں مقدر تھا

کب تک ہماری نئی نسلوں کے کورسوں میں رہے گی، سکندر تو جب دنیا سے گیا ہاتھ خالی تھا، تم تو دنیا میں ہاتھ خالی ہو۔

غالبؔ جیسی بھی ہستی کے فریب میں نہیں آئے عالم کو حلقۂ دامِ خیال جانتے رہے اور ہم نے دنیا بھر کے علوم اس شاعر کے دیوان میں ڈھونڈ ے جیسے آریہ سماج والے جیٹ ہوائی جہازوں کو ویدوں میں تلاش کر کے لاتے ہیں۔

اے صاحبو! دن بھر مصاحبوں کے جلو میں بیٹھے ناؤنوش کرنے والے، مجرا دیکھنے والے اور مشاعرے کرانے والے کچھ غدر کے ساتھ کچھ پچھلی صدی کے ساتھ گئے۔ کچھ پہلی جنگ میں فنا ہوئے، کچھ دوسری جنگ کے ساتھ ختم ہوئے۔ اچھا ہے ہم ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہار گئے ورنہ یہ بھی نہ ہوئے جو ہیں۔ مولوی محبوب عالم نے اپنے تاثرات اس وقت رقم کئے جب برطانوی حکومت کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ آزادی کا تصور بھی نہ تھا۔ ان کو دوسو سالوں تک کچھ ہوتا ہوا نظر نہ آیا۔ ہم اتنے مایوس نہیں—— دست و بازو بھی رکھتے ہیں، موقع ملے تو ذہن کی جودت میں بھی کمی نہیں ہے۔ بس اک ذرا یہ شاعری اور قناعت اور سوز وگداز اور وحدت الوجود اور مراعاۃ النظیر اور کونڈوں اور دیگر میلا دوں۔ جماعتِ ایں واں اور رویتِ ہلال وغیرہ کے مباحث نہ ہوں تو——!!



ادبی وثقافتی مینا بازار

دریائے مین (Main) کے ساحل پر آباد شہر فرینکفرٹ نے ہمیشہ آرٹ، سائنس اور ثقافتی قدروں کی سرپرستی کی ہے یہی وہ دلکش شہر ہے جہاں ادب اور فنونِ لطیفہ کی حوصلہ افزائی اور نشوونما کے لئے جرمنی کے اعلیٰ اور بیش قیمت انعام واکرام سے مشاہیرِ فن کو نوازا جاتا رہا ہے کیونکہ یہ شاعر اعظم گوئٹے کا شہر ہے، اس لئے ان کے نام کی نسبت سے ایک نام بہت مقبول اور قیمتی ہے۔

The Goethe Prize of the city of Frankfurt.

یہ انعام ۱۹۲۷ء سے ہر سال ۲۸ اگست کو گوئٹے کی سالگرہ کے دن دیا جاتا ہے۔ یہ ان فن کاروں کو دیا جاتا ہے جن کی کاوشیں گوئٹے کی یاد کا نمونہ ہوتی ہیں۔ پتہ چلا کہ ۱۹۵۲ء سے اس انعام کی قدر ومنزلت بڑھانے اور اسے مزید بیش بہا کرنے کی غرض سے ہر تیسرے سال دیا جانے لگا۔ اس انعام کے ساتھ نقد 5000 Dm تقریباً دولاکھ روپئے فنکاروں کو دیا جاتا ہے۔ شاعر، فلسفی، سائنٹسٹ اور موسیقار اس میں شامل کئے جاتے ہیں۔ ۱۹۲۷ میں جارج اسٹیفینسن کو پہلی مرتبہ اس اعزاز سے نوازا گیا۔ آج تک یہ سلسلہ چل رہا ہے ——— اس کے علاوہ بھی چند قابل قدر انعامات یہ ہیں جیسے:

1. Peace Prize of German Book Trade.
2. The Adorno Prize.
3. The Paul Ehrlich and Ludwig Prize.
4. Town Scribe of Bergen Enkhiem Prize.

ان تمام میں آخری انعام جرمنی کا سب سے اعلیٰ اور قیمتی ادبی انعام تصور کیا جاتا ہے۔

فرینکفرٹ وہ سنگم ہے جہاں پر اس سیاح کا رکنا ضروری ہے جو یورپ بلکہ دنیا کے سفر پر نکلتا ہے۔ ہر رنگ ونسل اور قسم کے لوگ خواہ کاروباری ہوں یا ادبی وثقافتی آپ کو فرینکفرٹ میں محوخرام مل جائیں گے۔ مجھے فرینکفرٹ میں زبان کے معاملہ میں زیادہ مشکلات کا سامنا نہ تھا۔ گو جرمن زبان کی خصوصی سے واقفیت نہ تھی مگر فرنچ کی طرح اس کے بھی کچھ نادر ونایاب الفاظ میری ڈائری میں محفوظ تھے۔ یہ اور بات ہے کہ دن بھر میں سو مرتبہ اسے کھول کر دیکھنا پڑتا تھا۔

اہلِ جرمن کی ایک ادا مجھے بہت بھائی کہ صحت منداور ہٹے کٹے جرمن، نازک اندام لکھنوی انداز کے فرنچ کی طرح نخرے والے اور فیشن زدہ نہ تھے۔ حالانکہ یہ لوگ بھی اپنی زبان کا گن گاتے رہتے ہیں مگر دوسری زبان وادب کی قدر کرنا بھی جانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر ہندستانی میری طرح اپنے آپ کو جرمنی کے فرینکفرٹ میں تنہا اور اجنبی محسوس نہیں کرے گا۔ یہاں ہندستانی، پاکستانی اور بنگلہ دیشی بڑی تعداد میں موجود ہیں نیز یہ کہ جرمنی اور ہندستان نے اپنے علمی اور ثقافتی تبادلے سے ایک خوشگوار ماحول اور دوستانہ مزاج تیار کر دیا ہے۔ جس طرح جرمن میں ہندستانی دارجلنگ چائے، ہر فرد وبشر کے لئے ایک ضرورت بن چکی ہے اسی طرح ہندستانی رقص بھارت ناٹیم، کتھا کلی وغیرہ کلاسی موسیقی اور آرٹ فلمیں ——— کے دلدادہ نظر آئے۔ فرینکفرٹ فلم کلب میں جرمن فلم دیکھنے کے ارادے سے گیا۔ مجھے چند تازہ دم اور جوان جرمن فلم ڈائرکٹروں کے نام پتے یاد رہ گئے تھے

جیسے Schloendorff Hrzog وغیرہ مگر وہاں اس دن کسی خاص ہندستانی فلم کی نمائش تھی جسے جرمن زبان میں ڈب کر کے دکھایا جاتا تھا۔ پوسٹر سے لگا کہ فلم کچھ جانی پہچانی ہے۔ ذہن پر زور دیا اور یاد آ گیا۔ بڑی حیرت ہوئی اور خوشی بھی۔ مرنال سین کی فلم ''پرسورام'' دکھائی جا رہی تھی۔ لوگ کافی تعداد میں جمع تھے۔ آج کے شو کا اہتمام وی سی آر (VCR) پر تھا۔ فلم میری دیکھی ہوئی تھی پھر بھی وہاں رک گیا اور شو کے بعد کلب کے سکریٹری سے ملاقات کی اور جب اسے پتہ چلا کہ میرا تعلق کلکتے سے ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کلکتہ کی معاشی اور سماجی زندگی آپ نے ابھی دیکھی، آپ کا اس فلم کے بارے میں کیا خیال ہے۔ مسٹر سام ہمبولڈ Sam Hambolut نے بتایا کہ اس فلم کو دیکھ کر میرا دل بے اختیار کلکتہ جانے کے لئے مچل اٹھا۔ مگر کیا واقعی آپ کا شہر دم توڑ رہا ہے۔ کاش میں کچھ کہہ سکتا۔ میری خاموشی دیکھ کر مسٹر سام نے بات آگے بڑھائی اور بتایا کہ ستیہ جیت رے، مرنال سین وغیرہ جرمنی میں کافی پسند کئے جاتے ہیں اور فلم ''پرسورام'' دو سال پہلے Manheim Festival میں آتی تھی جس کے ویڈیو کیسٹ خاص طور پر آج کے شو کے لئے منگوائے گئے تھے۔ اس فلم فیسٹیول میں بمل رائے کی ''دو بیگھا زمین'' رے کی آرانیر دن راتری'' مرنال کی ''پرسورام'' اور مظفر علی کی 'گمن' بہت سراہی گئی تھی۔ ہمارے مصور مقبول فدا حسین بھی جرمنی میں بہت مشہور ہیں اور اکثر ان کی مصوری کی نمائش ہوتی رہتی ہے۔ ہندستانی کتھک اور اوڈیسی (Odissi) رقص کے بخار میں جرمنی والے بری طرح مبتلا نظر آئے۔

جس طرح ہمارے شہر میں انگریزی بات چیت کے تین اور چھ ماہ والے کورس کی بھرمار ہے اسی طرح جرمن نازنینوں کے لئے ہندستانی رقص سیکھنے کے لئے ہر جگہ دو مہینے اور چھ مہینے کی ٹریننگ کلاس جاری ہیں۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ جس طرح ہمارے وطن میں چھ مہینے میں انگریزی زبان کے شیخ پیر یا شیکسپیئر ہو جاتے ہیں اسی طرح یہ حسینائیں بھی کتھک میں مٹک لیتی ہوں گی مگر صاحب نہیں، جرمن کہتے ہیں کس کو ہیں۔ ایک پروگرام میں میری فشر نامی محترمہ Marie Fischer کو بھارت ناٹیم رقص کرتے دیکھا تو میں عش عش کر اٹھا۔ اگر کلکتہ ہوتا تو سیٹی بجا کر آفریں کہتا۔ معلوم ہوا محترمہ شوقیہ ناچتی ہیں کوئی میراثن یا خاندانی امراؤ جان ادا نہیں اور مزے کی بات یہ کہ ہندستانی ادب پر ریسرچ کر رہی ہیں۔ افسوس اس کا ہوا کہ ہماری محترمائیں شاذو نادر ہی رقص و ریسرچ کرتی نظر آئیں گی۔ ارے قاعدے سے رقص ہی کر لیں یہ کیا کم ہے۔ ویسے ہمارے ملک میں بے قاعدہ ریسرچ تو عام ہے۔

پورے جرمنی خصوصاً بون (Bonn) میں ہندستانی ثقافتی پروگرام بہت ہوتا ہے اور طرح طرح کا ڈانس ورکشاپ منعقد ہوتا رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہمارے یہاں مشاعرے کثرت سے ہوتے ہیں۔ رقص و سرود کی بات نہ ختم ہونے والی ہے۔ کہیں ہمارے کرم فرما یہ نہ سمجھیں کہ میں جرمنی میں صرف ناچتا نچاتا رہا۔ ارے بھئی میرا تو ناچ بھی ٹیڑھا اور آنگن بھی۔ میں نے ایک عدد ڈرامہ بھی دیکھا۔ مولیئر کا ''لا آوارے'' مگر زبان کی ستم ظریفی کہ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔ اہل جرمن جتنے محنتی اور ثقافت پسند ہیں اتنے مذہبی بھی ہیں شاید کیونکہ فرینکفرٹ میں ہی جدھر نظر اٹھایئے کلیساؤں کے نوکیلے کلس نظر آتے ہیں۔ سرِ شام ان کلیساؤں کی گھنٹیاں بھٹکے ہوئے انسانوں کو راہ راست پر آنے کی دعوت دیتی ہیں اور گونجتی رہتی ہیں۔ فرینکفرٹ رنگا رنگ شوخیاں لئے ایک دلکش سیر گاہ ہے۔



http://www.kitaabghar.com

کوپن ہیگن کی حشر سامانیاں

میں جانا تو سویڈن اور ناروے چاہتا تھا مگر رک گیا کوپن ہیگن میں، پھر وہ آوارگی ہی کیا جس میں پروگرام کے تحت سفر کیا جائے، جب ہم کاسٹروپ ایئرپورٹ پر اترے تو موسم بہت خوشگوار تھا۔ ایئرپورٹ پر ہی اندازہ ہوا کہ یہ شہر بہت پُرسکون ہے۔ لوگ بہت دھیمی آواز میں بڑی ملائمیت سے باتیں کررہے تھے۔ کسٹم افسران سے لے کر بس ڈرائیور تک خوش لباس اور تازہ دم نظر آیا۔ ہر کسی کے چہرے پر مسکراہٹ۔ مجھے پہلی نظر میں یہ شہر دلگیر پسند آیا۔ کیا کہنے ہیں ڈنمارک کی راجدھانی کے۔ میرے خیال میں یورپ کا یہ واحد شہر ہے جو لاجواب اور تعجب خیز کہلانے کا حق رکھتا ہے۔

مجھے یہ شہر بے مثال اور بھی اس لئے بھایا کہ ہر سو میرے استقبال کو میرا نام کندہ تھا اور لوگ جیسے ورد کررہے تھے — Danish Cheese, Danish Cookies, Danish Disco وغیرہ وغیرہ۔ یہ اور بات تھی کہ ان کے تلفظ کی خامی تھی کہ دانش کو ڈینش پڑھتے تھے۔ اب کچھ تلفظ کی غلطیاں تو ہمارے یہاں بھی ہیں مگر مجھے ان کے خلوص میں کوئی کمی نظر نہیں آئی۔ ایئرپورٹ پر ہی میں نے کرنسی کا تبادلہ کرلیا۔ یہاں کی کرنسی کرونے (Krone) کہلاتی ہے اور پیسے ''اور'' (Ore)۔ میں نے بارہ کرونے کے آٹھ بس ٹوکن لئے اور شہر کے لئے بس پر سوار ہوگیا۔ مجھے Globe Trotter ہوٹل جانا تھا جو زیادہ دور نہ تھا۔ دس منٹ کی ڈرائیو کے بعد شاہراہ این گیوج پر بس ڈرائیور نے مجھے اتار دیا۔ یہ ایک ہرا بھرا پُرسکون علاقہ تھا۔ ہوٹل کے پیچھے ایک جھیل جھلملا رہی تھی۔ ریسپشن کاؤنٹر پر ایک خوب صورت ڈین لڑکی نے مسکرا کر ہیلو کہا۔ تیس ڈالر کا سنگل روم میرے لئے بک کردیا گیا اور مجھے چابی تھماتے ہوئے اوپر تیسری منزل کا پتہ بتادیا۔ میں تھکا ہوا تھا۔ سامان پٹخ کر بستر پر دراز ہوگیا۔ پتہ نہیں کتنی دیر سویا۔ آنکھ کھلی تو شام کا جھٹپٹا سا تھا۔ میں نے لباس تبدیل کیا اور باتھ روم کی طرف بڑھا۔ باہر گیلری میں ہلکی نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور پہلے باتھ روم کے دروازے پر ایک لال بتی جل رہی تھی۔ اس کے نیچے لکھا تھا۔ Bad Toilet۔ میں سمجھا اس میں کچھ خرابی ہے۔ آگے بڑھا دوسرے پر بھی یہی لکھا ہوا تھا۔ میری نیند پوری طرح غائب نہیں ہوئی تھی۔ سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ سارے باتھ روم خراب کس طرح ہوسکتے ہیں اور اگر ہیں تو ہم فراغت کیسے حاصل کریں؟ کمرے میں آکر میں نے فون کر کے روم سروس والا نمبر ڈائل کیا۔ اس وقت معصومیت والی ہیلو بہت کھلی۔ میں نے ماجرا کہہ سنایا۔ فوراً ایک محترمہ حاضر ہوئیں۔ بے جھجک باتھ روم میں داخل ہوکر فوراً باہر لپکیں اور مجھے حیرت سے دیکھا۔ میں نے لال بتی کے نیچے Bad Toilet کی طرف اشارہ کیا۔ محترمہ نے بڑی خندہ پیشانی سے بتایا کہ Bad ڈینش میں Bath کو کہتے ہیں۔ میں شکریہ ادا کرتے ہوئے Bad Toilet میں گھس گیا واقعی Bad باتھ روم اندر سے بہت بڑھیا نکلا۔

آرام اور فراغت کے بعد اپنے کمرے کا معائنہ کیا۔ سنگل روم، میوزک سسٹم ٹی وی، چھوٹی فرج اور کافی میکر بہت قرینے سے موجود تھے۔ میں نے پہلے کافی بنائی اور چسکیاں لیتا ہوا بالکنی پر آگیا۔ شام ہوچکی تھی۔ شہر میں چراغاں تھا۔ راستوں پر لوگ مزے سے چہل قدمی کررہے تھے۔ یہاں پیرس اور فرینکفرٹ والی بھاگ دوڑ نہ تھی۔ ہم اپنے اکلوتے ایوننگ سوٹ میں نیچے آئے۔ کاؤنٹر پر ٹیکس فری مسکراہٹ سے اب کوئی اور دوشیزہ نواز رہی تھی۔ میں نے لنگر خانوں کا دریافت کیا۔ محترمہ نے بڑی ادا سے بتایا کہ کوپن ہاون (یہاں کا تلفظ) میں تقریباً ۲۰۰۰ ریستوران آباد ہیں۔ آپ کہاں اور کیا کھانا پسند کریں گے؟ میں نے دوسرا سوال کیا کہ یہاں کی خاص ڈش کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ Somorrebrod نامی سینڈوچ

سیاحوں میں بہت مقبول ہے۔جس کی تقریباً ایک سو قسمیں موجود ہیں۔اب آپ جو پسند کریں یا پھر ''ہاٹ ڈاگ'' آپ کو ہر چوراہے پر مل جائے گا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ دوبارہ چہکی۔اگر آپ چاہیں تو انڈین ڈش بھی مل سکتی ہے۔کچھ سوچ کر اس نے بتایا کہ ویسٹر بورگید پر تاج انڈین ریستوران اور نیو دہلی ریستوران بھی موجود ہے مگر یہ رات کے گیارہ بجے بند ہو جاتے ہیں جب کہ دوسرے رات کے دو بجے تک اور کچھ صبح پانچ بجے تک کھلے رہتے ہیں۔اس کے علاوہ امریکن فاسٹ فود اور سیلف سروس والے ''میکڈانلڈ'' برگر کنگ اور اسنیک بار کی کمی نہیں۔یاں یاد آیا پاکستانی مغل ریستوران بھی اچھا ہے۔میں نے محترمہ کی بات کاٹی اور تیسرا سوال کیا۔تمہاری زبان میں شکریہ کو کیا کہتے ہیں؟ اس نے مسکراتے ہوئے کہا ''تھک'' میں نے اسی انداز میں تھک کہا اور بائی بائی کرتا باہر آ گیا۔واقعی بے چاری میرے سوالوں سے تھک چکی ہوگی۔

راستے پر خاص بھیڑ نہ تھی اور لوگ مزے سے خوش گپیوں میں مصروف ٹہل رہے تھے۔میں بھی ایک سمت چل پڑا۔کچھ ہی فاصلے پر ایک فلم ہال دیکھ کر رکا مگر اس سے متصل ایک Pak-Cafe دیکھ کر اندر گھس پڑا۔میں مینو بورڈ پر اپنے مطلب کی چیز اور قیمت دیکھ رہا تھا کہ کاؤنٹر پر کھڑے جوان نے کھنکار کر گلاس صاف کیا۔میں فوراً موصوف کی طرف متوجہ ہوا۔ایک خوش شکل، خوش لباس جوان میرے آرڈر کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اردو میں بات شروع کی۔اس کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے کہا ''سمیع'' میں نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور کہا ''دانش'' محترم نے فوراً پوچھا آپ پاکستان میں کہاں سے ہیں۔میں نے الٹا سوال کیا۔کیا اردو آج کل صرف پاکستان میں بولی جاتی ہے۔وہ خفت مٹانے کے لئے ہنس پڑا۔اتنے میں پیچھے سے کسی نے پکارا Samy اور بات ادھر ادھر ہو گئی۔میں نے ایک سینڈوچ کا آرڈر دیا۔ سمیع مجھ سے بے تکلف ہو چکے تھے۔انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب ہم آپ کو بن کباب کھلاتے ہیں جب تک آپ کافی پیئیں۔

میں نے بخوشی اس آفر کو قبول کر لیا کہ کباب کھائے عرصہ ہو گیا تھا۔کافی کے دوران خوب باتیں ہوئیں۔سمیع کو ڈین زبان پر عبور حاصل تھا اور وہ اپنے کسٹمروں سے فر فر باتیں کر رہے تھے پتہ چلا کہ ۱۹۷۰ میں ڈنمارک نے اپنے دروازے ہنر مند لیبر اور انجینئر وغیرہ کے لئے کھول دیئے تھے۔پھر کیا تھا پاکستانی، ٹرکش اور یوگوسلاوین دیکھتے دیکھتے ابل پڑے جس میں پاکستانی خاصی تعداد میں موجود ہیں لہٰذا کوپن ہیگن میں اردو کوئی عجوبہ نہ تھی۔

سمیع نے کھلایا کباب مگر چارج کیا سینڈوچ اور کافی کی قیمت۔پتہ چلا کہ کباب کیفے میں بکتا نہیں اپنے کھانے کے لئے اس نے بنوائے تھے۔میں نے شکریہ ادا کیا اور اجازت چاہی۔اٹھتے اٹھتے سمیع نے مشورہ دیا کہ آپ بس اور ٹیکسی کا چکر چھوڑیں۔کل صبح سائیکل سے شہر گھومیں۔ بہت مزا آئے گا۔یہی اس شہر کا اسٹائل ہے۔میں نے دوبارہ 'تھک' یعنی شکریہ کہا اور باہر نکل پڑا۔

قریب ہی Tivoli Gardens تھا۔یہ ایک خوبصورت پارک تھا جہاں رات گئے تک بھیڑ رہتی ہے۔رنگ برنگی قمقموں اور فواروں سے پورا پارک جگمگا رہا تھا۔پرستان کا ماحول لئے اس وسیع و عریض سیر گاہ میں تھیٹر کانسرٹ ہال، بیلے، پینٹو مائم، ورائٹی شو، برقی ہنڈولے، آرکسٹرا، ڈانس فلورا اور کیبرے کا شو ہو رہا تھا۔ان سے پرے ایک طرف آتش بازی کے نظارے مسحور کر دینے والے چل رہے تھے۔ان کے درمیان تقریباً ۲۰ ریستوران دنیا بھر کے پکوان بیچ رہے تھے۔اس پارک میں اتنی چیزیں یکجا تھیں کہ یاد رکھنا مشکل ہے مگر کوپن ہیگن کے جانے والوں کے لئے Tivoli جانا اور محظوظ ہونا ضروری ہے۔



زندہ دلانِ گلگشت اور ہم

کوپن ہیگن یورپ میں ہوتے ہوئے بھی یہاں کے نخروں اور جھوٹی نمائشوں سے الگ تھلگ ہے۔ یہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں کے باشندے بھی اسے Hyggelig کے لفظ سے یاد کرتے ہیں جس کے معنی ہیں گرم جوش مگر پرسکون۔ ان کے نام، جملے اور تلفظ بڑے ثقیل ہیں مگر ڈین لوگ فرنچ اور جرمن کی طرح انگلش سے بدکتے نہیں۔ ان کی بولی میٹھی اور انداز دوستانہ — یہاں کی عمارتوں سے زیادہ مجھے لوگ باگ اچھے لگے۔ باتونی مخلص، ہنس مکھ، خود کو لئے دیئے رہنے والے نہیں بلکہ ہر دم دوستی کو تیار۔

میں نے یہاں لوگوں کو بہت سوشل پایا۔ پیدل چلتے، سائیکل چلاتے، پارکوں میں شطرنج کھیلتے، کیفے اور بازار میں چہکتے، کلبوں میں ناچتے، بازاروں میں خرید و فروخت کرتے ہر جگہ ان کے مزاج میں نرمی، زندہ دل اور انسانوں سے محبت کرنے والے۔

اس شہر کو دنیا کی قدیم سلطنتوں میں سے ایک کی راجدھانی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس کی آبادی تقریباً بیس لاکھ ہے اور یہ ناروے اور سوئیڈن کا صدر دروازہ ہے۔ یہاں چودہویں اور سترہویں صدی کی عظیم الشان عمارتیں اور محلات آج بھی اسی شان و شوکت سے ایستادہ ہیں۔ ان کے شانہ بشانہ ماڈرن اپارٹمنٹ بھی آج کی فیشن ایبل سوسائٹی کی تصویر پیش کر رہے ہیں۔ آٹھ سو سال پرانا، یہ شہر روز بہ روز جوان ہوتا نظر آتا ہے۔

صبح میں نے ہوٹل کے قریب ہی ایک سائیکل اسٹینڈ سے اپنی پسند کی سائیکل ۲۵ کرونے میں دن بھر کے لئے اٹھائی تھی۔ مجھے بندرگاہ کی طرف جانا تھا۔ پیرس کے سمبل ایفل ٹاور کی طرح کوپن ہیگن کا سمبل لٹل مرمیڈ Little Mermaid ہے۔ کوئی آدھ گھنٹے سائیکل گھسیٹنے کے بعد ہم بندرگاہ پر پہنچے۔ اس خوبصورت اور ہرے بھرے گلگشت نے میری ساری تکان دور کر دی۔ میں نے سائیکل دوسروں کی دیکھا دیکھی ایک کنارے کھڑی کی اور تالہ لگانے کی ضرورت محسوس نہ کی کیونکہ اس میں تالہ تھا ہی نہیں۔ یا تو یہ تھا کہ یہاں کے شہری بڑے ایماندار یا پھر یہاں سائیکلوں کی بھرمار کی وجہ سے چوری کا مزا جاتا رہا تھا۔ سمندر کے بیچ ایک چٹان پر پتھر کی جل پری جسے لٹل مرمیڈ کہتے ہیں بیٹھی ہے۔ یہ ہنس کرسچن انڈرسن کے پریوں کے قصوں سے متاثر ہو کر بنائی گئی اور اب سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ کچھ ہی فاصلے پر انگلش چرچ کی پرشکوہ عمارت اور اس سے پرے ۱۹۴۰ء کی جنگ آزادی کے مجاہدوں کا عجائب خانہ آباد ہے۔

مجھے ٹھیک بارہ بجے ایمالنبورگ محل جو کہ ملکہ کا شاہی مسکن ہے پہنچنا تھا کیونکہ بارہ بجے شاہی گارڈ کے دستے بدلے جاتے ہیں مگر راستے میں زردوزی کے کام والے لال کوٹ میں ملبوس عجیب و غریب ڈاکئے کو دیکھ کر رک گیا جو خط اس طرح پہنچا رہا تھا گویا شاہی فرمان پہنچا رہا ہو۔ اس وضع داری میں بھی اس کے چہرے پر حلیمی اور مسکراہٹ تھی۔ مجھے اپنے دیسی پھٹے حال اور رنگ چڑھے ڈاکئے بیچارے بری طرح یاد آئے۔ اسکے بعد نظر ایک چمنی صاف کرنے والے پر رکی جو سوٹ اور پینٹ میں بڑی شان سے اپنا کام کچھ گنگناتے ہوئے کر رہا تھا۔

جب میں شاہی محل تک پہنچا ایک دستہ شاہی گارڈوں کا مارچ پاسٹ کرتا ہوا نکل رہا تھا اور دوسرا تازہ دم دستہ کورنش بجاتا بڑی تیزی سے اپنی جگہ بنا رہا تھا۔ زرق برق لباس اور بھالو کی کھال کی سیاہ ٹوپی میں شاہی گارڈ اور ان کا مارچ پاسٹ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ شاہ فیڈرک پنجم کا مجسمہ محل کے آنگن میں نصب ہے مشرقی حصے کی چھت پر لہراتا ڈنمارک کا پرچم اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ ملکہ محل سرا میں مقیم ہے۔

یہاں جمہوریت کی بنیاد ۱۸۴۹ء میں ڈالی گئی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر ڈینش پارلیمنٹ کی عمارت تھی۔ اس سے کچھ دور شاہی اسلحہ عجائب خانہ اور اس کے بعد یہاں کا سپریم کورٹ ان کے ساتھ ہی کرسچن بورگ محلات کا سلسلہ تھا۔

میں نے پیرس اور فرینکفرٹ میں اتنے میوزیم اور محل دیکھے تھے کہ اب اور عجائب خانوں کے نام سے الجھن ہو رہی تھی۔ میں نے سائیکل ایک کولڈ ڈرنک والے کے اسٹال پر روکی اور پیپسی کولا لیا اور پیاس بجھائی ساتھ گائیڈ بک میں کچھ قاعدے کی جگہ ڈھونڈ رہا تھا کہ چرچ کالم میں ''نصرت جہاں مسجد'' پر نظر کی جو ایک منزل ایلے پر واقع تھی۔ میں نے پیپسی کی قیمت ادا کی، اسٹال والے سے مسجد کا ٹھکانہ پوچھا اور سائیکل دوڑا دی۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد وہ جگہ مل گئی۔ دیار افرنگ میں مسجد کی ایمان افروز عمارت خوب تھی مگر میری بدقسمتی کہ اس کے گیٹ بند تھے اور نوٹس میں جمعہ کی نماز ساڑھے تین بجے دوپہر لکھا تھا اور آج دن بدھ کا تھا اور کل دوپہر مجھے رخصت ہونا تھا۔ اس کے علاوہ معلوم ہوا کہ ایک سنٹرل ماسک بھی ہے جو یہاں سے کافی دور ہے۔

واپسی پر ہم راؤنڈ ٹاور، سٹی ہال، میکانیکل میوزک میوزیم، رائل میوزیم آف فائن آرٹ نیشنل میوزیم، اسٹاک ایکسچینج دیکھنے یعنی باہر سے دیکھتے اور چھوڑتے سائیکل اسٹینڈ پر پہنچے۔ اس نے گوڈے یعنی ہیلو کہہ کر سائیکل لے لی۔ میں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے تھک یعنی شکریہ کہا۔

میں دن بھر کی آوارگی سے تھک چکا تھا اور وقت بھی میرے پاس کم تھا اس لئے آج کے پروگرام میں مجھے صرف ایک آخری چیز دیکھنی تھی اور وہ لوئس ٹو ساڈس ویکس میوزیم تھا جو انڈرسن بولووار پر تھا۔ جب میں اس عجائب خانے پہنچا تو دیکھا ایک خلقت ٹکٹ کی لائن میں لگی ہے۔ میں نے سوچا ٹال جاؤں مگر اس میوزیم کی بڑی تعریف سنی تھی۔ جبراً قہراً لائن میں کھڑا ہونا پڑا۔ دس منٹ میں میرا نمبر آیا۔ بارہ کرونے کا ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوا۔ سامنے ڈینش گارڈ استقبال کو لپکے پڑتے تھے۔ اس میوزیم کی خاصیت یہ تھی کہ یہاں موم کے قد آدم مجسمے، عالمی مشاہیر فن اور معزز و ہر دلعزیز ہستیوں کے یوں سجے تھے کہ اب بولنا ہی چاہتے ہیں۔ ایک گائیڈ تمام مجسموں کے بارے میں تفصیل بتا رہا تھا۔ سب سے پہلے شاہی استقبالیہ میں لے جایا گیا جہاں ڈنمارک کی ملکہ، بادشاہ اپنے وزرأ کے ساتھ بڑی شان و شوکت سے جلوہ فگن تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ بس اب شاہی فرمان جاری ہوا چاہتا ہے۔

اس کے بعد ایک پریس کانفرنس میں گیا جہاں ہٹلر اعظم، چرچل، کاسٹرو، کنیڈی، ریگن اور مارگریٹ تھیچر تک موجود تھیں۔ اس سے متصل کمرے میں بیٹلز گروپ کو پھر سے یکجا کر دیا گیا جس میں جارج ہریسن گٹار بجا کر اپنے ساتھیوں کو کوئی نئی دھن بتا رہا تھا۔ اسکے بعد چارلی چیپلن، لارل ہارڈی پبلک کو ہنسا رہے تھے۔ دوسرے ہال کے اسنو کوئنز کاسل میں دنیا بھر کی شہزادیاں، شاہزادے، چڑیلیں، دیو اور طرح طرح کی کریہہ مخلوقات، الف لیلیٰ کے دور کو زندہ کئے ہوئے تھیں۔ اس کے بعد رونگٹا کھڑا کر دینے والا ''چیمبر آف ہورر جس میں ہچکاک اپنے کرداروں کے ساتھ بڑے بھیانک مناظر پیش کر رہا تھا۔ اسکے اور آگے ڈریکولا ایک مظلوم عورت کے گلے سے خون چوس رہا تھا۔ اس نیم تاریک ہال میں چمگادڑ کے اڑنے سے عجیب خوف طاری تھا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ کمرے تھے مگر اس سے پہلے کہ مجھے بھی موم جامہ یا مومیائی کر کے ایستادہ کر دیا جاتا، میں موم کی اس جنت دوزخ سے نکل آیا۔



پھر اس کے چراغوں میں روشنی نہ رہی

کہا جاتا ہے کہ کوپن ہیگن کی بنیاد ۱۱۶۷ء میں ایک پادری Absalon ابیسالان نے ڈالی جس کا مجسمہ بڑی عقیدت سے شاہراہ ہوبرو پلاڈ پر ایستادہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اس شہر نے عیسائیت کا خوب پرچار کیا اور زیادہ تر لوگ عیسائی ہیں اور بے شمار عظیم الشان گرجے پرانی قدروں کو زندہ رکھنے کی کوشش میں سرگرم عمل ہیں —— مگر افسوس!

یورپ کے دوسرے شہروں کی طرح اس شہر کو فری سیکس سوسائٹی کی ہوا لگی اور خوب لگی۔ مردوں نے جب Social Benefits حاصل کیا تو عوتوں نے بھی لڑ مرکر ۱۹۲۰ء میں ہی اپنے حقوق کو منوالیا۔ آج عورتیں نہ صرف مردوں کے شانہ بشانہ بلکہ ان سے آگے اڑی جارہی ہیں۔ اب تو پردے سے پردہ اٹھ رہا ہے۔ عورتیں وہ سب کر رہی ہیں جسے ہم لوگ سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ بدنام سویڈن ہے۔ یہیں سے تمام ہنر اور کارستانیاں برآمد کی جاتی ہیں اور بازارِ عشق میں استعمال کی جاتی ہیں۔ کوپن ہیگن میں بھی ایسے باذوق بازارِ عشق ہیں جہاں مردوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ اب تک جو قصے اور داستانِ حقیقی ہم امراؤ جان، مغل جان او ہیرا بائی کے متعلق سنتے تھے سب پرانے ہوئے۔ آج یہاں خوبرو اور تندرست جوان بزمِ عشق سجائے بیٹھے ہیں اور عشق کی سیل لگی ہے۔ باعزت اور دولت مند شریف زادیاں عشق کی خریدار ہیں اور منہ مانگی فیس ادا کر رہی ہیں، کون ہے جو انہیں روکے اور کیوں روکے؟

مرد بھی پیچھے کہاں ہیں۔ انہوں نے بھی قومِ لوط کے کرداروں کو زندہ کر دیا ہے۔ خواجہ سراؤں کی ٹولیاں سرمستی میں مصروف اپنی الگ بزم اور کلب اور سینما گھر اور بار بنائے خوش ہیں۔ مذہب سے بیزاری اور بغاوت کے باوجود، طرفین کے لوگ سنڈے گرجا گھر چلے جاتے ہیں جواب سوشل گیٹ ٹوگیدر ہو کر رہ گیا ہے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہے کہ حسن وعشق دونوں کی اپنی پسند کی جنس ٹکرا جاتی ہے اور وہ خدا کا شکر بجالاتے ہیں مگر تمام عاشقی، فاسقی اور بدمستیوں کے باوجود ڈین لوگ اپنی مخصوص مسکراہٹ اور دھیمی آنچ پر سلگتا لب ولہجہ اور اخلاق کا پیکر اور What not کا مجسمہ ہیں یعنی یار لوگ دھوکہ بھی خلوص سے دیتے ہیں اور ہمیں بھی خلوص سے دھوکہ کھانے میں مزا آتا ہے۔

میرے ہاتھ میں اسوقت ''کوپن ہیگن بائی نائٹ'' نامی کتابچہ ہے جو مجھے ہوٹل والوں نے دیا تھا۔ صفحہ اول پر ہی کسی اسٹوڈیو ون کا اشتہار ہے جس میں کوئی نیلی پیلی فلم کا اشتہار ہے۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی ہوش ربا نائٹ کلب اور Massage Parlour اور Escort Service کا اشتہار دعوت عام دے رہا ہے۔ ان دنوں ایسکورٹ سروس کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ یعنی آپ اکیلے ہیں تو آپ کی دل بستگی کے لئے ایئرپورٹ سے ہوٹل تک آپ کی پسند اور پاکٹ کے مطابق حسن کا انتخاب اور اہتمام ہے۔ یہ ہنرمند اور سلیقہ شعار بچیاں آپ کے سفر، قیام اور شاپنگ تک کی تمام پریشانیاں اپنے سر لے لیتی ہیں۔ بس صرف آپ انہیں اپنے سر لئے پھریں۔ اب میں اور کیا بتاؤں۔ بہتر ہوگا کہ اس کتابچے سے کچھ سرخیاں اڑاؤں اور ناظرین کی خدمت میں پیش کردوں۔ اس کے علاوہ اور کیا کروں؟

اے غمِ دل کیا کروں
اے وحشتِ دل کیا کروں

جن حضرات کو میری کوتاہ نظری سے اختلاف ہے یا جن ساتھیوں کو میری نااہلی سے اکتاہٹ ہے کم بخت پوری تفصیل کیوں نہ لکھی، وہ آج ہی واپسی ڈاک سے ''پرائیوٹ خط'' لکھیں یا ذاتی طور پر In Person ملاقات کریں۔ اللہ نے چاہا تو مایوسی نہ ہوگی —— (نوٹ): تمام تفصیلات، دہلی والے بڑے حکیم صاحب کی طرح صیغۂ راز میں رکھی جائینگی۔

اور ہاں —— ''پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی''!

●●●

لندن ------ دیس پرایا کیسا؟

لندن یعنی ولایت یا یوں کہئے کہ برطانیہ عظمیٰ سے ہماری تاریخی، سیاسی اور ثقافتی یاد اللہ رہی ہے بلکہ خوب رہی ہے۔ ہمارا سابق آقا جس کے دربارِ عالی کا سورج غروب نہیں ہوتا تھا اب طلوع ہونے میں ہچکچاتا ہے مگر ہم پرانی قدروں اور رشتوں کو استوار رکھنے کے قائل ہیں۔ آج بھی ہم ''سوری'' اور ''تھینک یو'' سے خود کو آزاد نہیں کر سکے ہیں۔ اس میں قصور آقا کا نہیں دراصل ہم خود آزادی کے اہل نہ تھے کہ چند نام نہاد حریت پسندوں نے اپنے مفاد کی خاطر ہمیں ایک ان دیکھی مصیبت میں ڈال دیا۔ کہنے کو ہم آزاد ہوئے مگر ذہنی طور پر امپیریل بہادر کا دبدبہ اب بھی ہم پر سوار ہے۔ آج بھی ہمارے یہاں ولایت خان موجود ہیں اور وظیفہ و وثیقہ پاتے ہیں اور آج تک ہم سنڈے کو کام کرنا حرام تصور کرتے ہیں۔ جب ذہن ایسا شکست خوردہ ہو تو کون کم بخت لندن میں خود کو تنہا محسوس کرے گا۔ ۱۸۵۷ میں شکست خوردہ ہندستانی قوم کو گوری بانہوں میں ڈال کر اپنی قسمت پر قناعت کرنے کی عادت ڈال رہی تھی تو شرفا و امراء اپنی عزت اور قابلیت پر صیقل کرانے کے لئے دیارِ انگلستان کا طواف کرنے اور لندن پلٹ یا لندنی کہلانے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ بقول اکبر الہ آبادی:

سدھاریں شیخ کعبے کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

میں بھی خدا کی شان دیکھنے لندن کے ہیتھرو ایئر پورٹ پر بغیر شاہی اطلاع کے اتر گیا۔ دل باغ باغ ہو گیا۔ ایسا لگا کہ چنڈی گڑھ کے ماڈرن اسٹیشن میں کھڑا ہوں۔ ہمارے برادرِ وطن رنگ برنگی پگڑیوں میں اپنی سرداری کا لوہا منوا کر رواں دواں نظر آئے۔ یہاں تک کہ سردار عورتیں سنگ مرمر کے چکنے فرش پر مین لابی میں جھاڑو لگا رہی تھیں۔ پنجابی یہاں کی خاص زبان ہے۔ پاس کے کیفے پر میں نے ایک لڑکے سے (پنجابی) میں چائے لانے کو کہا۔ پہلے تو اس نے بغور میری داڑھی کا مطالعہ کیا پھر خوش ہو کر کہا کہ پاؤ بھر دودھ کی تیز پتی والی وہ چائے پلاؤں گا باؤ جی کہ یاد رکھو گے۔ بخدا آج تک وہ چائے مجھے یاد ہے جسکی قیمت اٹھارہ روپئے فی گلاس تھی۔ اس حسین اتفاق کے بعد میں نے پنجابی بولنے کی ہمت نہیں کی۔

میں نے ایئر پورٹ پر ہی معلومات حاصل کی اور شہر سے دور مڈل سیکس کے گاؤں میں ہوٹل آرلنگٹن کا انتخاب کیا۔ گو کاتج نما یہ ہوٹل میری ہلکی جیب پر بہت بھاری تھا مگر آس پاس کے ماحول اور ہوٹل کی سادگی نے کچھ سحر کر دیا تھا اور میں اسے برداشت کر گیا۔ میں بنیادی طور پر ڈرامہ کا طالبعلم ہوں۔ لندن میں پڑاؤ اسی لئے کیا تھا کہ کچھ تھیٹر دیکھ سکوں اور سیکھوں ساتھ ہی یہاں کے دیہات میں ذہنی سکون حاصل کروں۔ پیرس اور فرینکفرٹ کے طویل سفر سے میں تھک سا گیا تھا اس لئے دیہات کی کھلی فضا اور نیچر کی دلکشی مجھے خوب بھائی۔ ہندستان میں دیہات اور دیہاتیوں کی کمی نہیں مگر لندن کے قرب و جوار اپنی مثال آپ ہیں۔

میرے لندن کے قیام سے جس قدر برٹش امیگریشن والے مشکوک تھے اس سے کہیں زیادہ میرے گھر والے متفکر کیونکہ یہاں کچھ عرصے پہلے نسلی فساد کی خبر پریشان کن تھی۔ حد یہ تھی کہ آتے وقت نصف درجن امام ضامنوں سے مجھے لیس کر دیا گیا تھا جو سوٹ کیس میں پڑے ہوئے میرے کلکتہ پہنچنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ پہلی فرصت میں میں نے فساد کے بارے میں پوچھ تاچھ شروع کی مگر کوئی بھی اس پر کھل کر بات کرنے کو تیار نہ تھا۔ گو کہ اب حالات بالکل نارمل تھے مگر راکھ کے اندر چنگاری دبی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ خیر۔ پتہ چلا کہ برطانیہ میں اس وقت تقریباً تین نسل پرست

پارٹیاں سرگرم عمل ہیں۔ان میں برٹش موومنٹ اور نیشنل فرنٹ خاص طور پر مشہور ہیں۔ان پارٹیوں کا تعلق بین الاقوامی دائیں باز وانتہا پسندوں اور کوکلس کلاں جیسی بدنام زمانہ تنظیموں سے ہے انہیں بعض سیاسی لیڈروں کی سرپرستی حاصل ہے۔ ان کے گروپ اسکولوں ،کلبوں اور یوتھ آرگنائزیشنوں میں پوری طرح پھیل گئے ہیں اوران میں نسلی تعصب کا زہریلا پروپگنڈہ کررہے ہیں اور انہیں کالوں اور ایشیائی لوگوں کے خلاف تشدد کے لئے اکسا رہے ہیں ان میں اسکن ہیڈ (Skin Head) کچھ زیادہ ہی سرگرم عمل ہیں جو قتل وغارت گری اور تشدد کی پالیسی اپنائے ہوئے ہیں۔یہ فاشسٹ اپنے آپ کو ہٹلر کا پیروکار کہتے ہیں۔

بہرحال یہ برطانوی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ نسلی منافرت کے اس بڑھتے ہوئے رجحان پر قابو پانے میں کوشش اور اس کی اقتصادی اور نفسیاتی وجوہ کے خاتمے کے لئے ٹھوس تدابیر اختیار کرے۔

جب میں نے تسلی کرلی کہ میری داڑھی کو کسی اسکن ہیڈ سے کوئی خطرہ نہیں ہے تو میں نے ہاتھ پاؤں نکالے اور شہر کا رخ کیا۔ویسے جی تو چاہتا تھا کہ تصور جاناں کئے بغیر رہیں کیونکہ موسم خزاں کا دوردورہ تھا۔پتے شاخوں سے جدا ہو رہے تھے مگر زمین پر گر کر سنہرے ہوتے جارہے تھے۔ اسی دلفریب خزاں پر میں اپنی بہار نثار کرنے کو تیار تھا۔کاش ایسی خزاں ہمارے وطن میں بھی ہوتی لیکن :

ابھی خزاں ہے تو ہے یہ عالم بہار آئی تو کیا کریں گے
گلوں کا دامن رفو کریں گے کہ اپنا دامن سیا کریں گے

کتاب گھر کی پیشکش
http://www.kitaabghar.com
urdukutabkhanapk.blogspot.com

سیر سپاٹے لندن کے

لندن نے بھی مجھے آدابِ سحر خیزی نہیں سکھائی۔ میں وہی صبح آٹھ اور نو کے بیچ اٹھتا اور آدھ گھنٹہ کمبل میں گھسا کھڑکی کے باہر کی دنیا کو دیکھا کرتا۔ میری کاہلی نے رنگ دکھایا اور موسم یکسر بدل گیا۔ یخ بستہ ہوا چلنے لگی اور ہلکی پھوار بھی پڑنے لگی۔ یا خداوندیہ کون سا موسم ہے، پتہ چلا کہ یہاں ہر موسم میں بارش رنگ رلیاں مناتی رہتی ہے اور اب کچھ ہی دنوں میں برفباری بھی ہوگی۔ اکتوبر کے آخری ایام تھے، جونہ ہوتا کم تھا۔ میں نے وقت ضائع کئے بغیر شہر کا رخ کیا اور اس بدحال موسم میں شہر دیکھنے کا ارادہ کیا۔ ٹیوب ریلوے سے پکاڈلی سرکس آیا جو لندن کی چورنگی ہے وہاں سے کوئی پچاس روپئے کا ٹکٹ لے کر ایک لال رنگ کی دومنزلہ بس میں سوار ہو گیا۔ ایک نک چڑھی میم بڑی ادا سے گائیڈ کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ ہاں تو صاحب میں نے دیکھنا شروع کیا بس کی اسپیڈ کے ساتھ اس کی زبان بھی چل رہی تھی۔ یہ ولنگٹن میوزیم ہے۔ اس کے بعد نیشنل گیلری، قلوپطرہ نیڈل اور یہ رہا رائل اکسچینج۔ اس کے پاس سینٹ پال کا گرجا۔ اس کے آگے ویسٹ منسٹر ایبے پھر لا کورٹ اور اب ہاؤس آف پارلیمنٹ اور یہ ٹاور آف لندن میں اسی جگہ اتر گیا اور ٹاور کو قریب سے دیکھنے لگا۔ یہ تیرہویں صدی کی عمارت یا عمارتیں ہیں۔ بڑے بڑے بادشاہوں اور ان کی بیگمات اور امراء نے اس عمارت میں اسیری کے دن کاٹے ہیں اور ان میں سے اکثر نے اپنی گردنیں شاہی کلہاڑے کی نذر کی۔ جن میں ملکہ کیتھرائن ہوارڈ اور این بولین ہنری ہشتم کی بیگمات شامل ہیں۔ یہ زنداں شاہی خاندان کے لئے مخصوص تھا۔

دریائے ٹیمز اس کے دامن میں رواں ہے۔ ان خونی برجیوں میں آج بھی ان شرفاء کی روحیں بھٹکتی ہوں گی جنہیں سولہویں صدی عیسوی میں بھینٹ چڑھایا گیا یا اسیر کیا گیا۔ ان میں ڈیوک آف بکنگھم ارل آف ایلکس، ڈیوک آف سمرسٹ، لیڈی جین گرے، ڈیوک آف من مٹھ، ایسے نہ جانے کتنے۔ ٹاور کی ایک جانب جنگ میں استعمال شدہ ہتھیاروں، زرہ بکتر وغیرہ کا عجائب گھر ہے۔ لندن میں عجائب خانوں کی کمی نہیں۔ میں نے اپنے سفر میں اتنے عجائب خانے دیکھے ہیں کہ ''دل کانپتا ہے اب تو عجائب خانوں کے نام سے''، میں موقع نکال کر مشہور ہائیڈ پارک بھی دیکھنے گیا۔ مجھے کلکتہ کا ڈلہوزی اسکوائر یاد آ گیا۔ پارک کیا تھا ایک میلہ لگا تھا۔ سیاسی تقریریں ہو رہی ہیں اور کھلی اجازت کہ جو کہہ لو۔ اس کے علاوہ دانت صاف کرنے کی تدبیر بھی ایک صاحب بتا رہے ہیں۔ کوئی دل جل دل نہ لگانے کی تلقین کر رہا ہے۔ یہاں گورے روسیاہ اور سیاہ فام سادہ دل بھی دیکھئے، ہاں سرداروں کو پھر دیکھا۔ مجھے اس برادری کی ایک ادا خوب بھاتی ہے کہ اس نے اپنی شناخت کو برقرار رکھا ہے۔ ویسے یہ ہر شریفانہ پیشے میں خود کو ڈھال لیتے ہیں۔ بس کنڈکٹر اور ہوٹل کے بیرا سے لے کر بیمہ کمپنی کے جنرل منیجر بھی ہیں۔

لندن میں ساؤتھ ہال کے عقب میں کچھ ایسی ہندستانی، پاکستانی اور اب بنگلہ دیشی بستیاں آباد ہیں کہ کلکتہ کی بستیاں ان پر رشک کریں۔ بارش میں بھیگتا ہوا میں اپنے ہم وطنوں کو دیکھنے گیا۔ ان علاقون میں اردو پنجابی کا بول بالا ہے۔ سبھی بڑے مزے کا دھندہ کر رہے ہیں۔ پاکستانی نہاری، کلیجے اور قلیہ قورمہ بیچنے میں مگن اور ہندستانی چھولے بھٹورے اور بھیل پوری بیچ کر خوش بنگلہ دیشی کیوں پیچھے رہتے۔ وہ بھی مچھلی کے قتلے اور رس گلے کی بہار دکھا رہے ہیں۔ راستہ جگہ جگہ ٹوٹا ہوا ہے۔ آتی جاتی گاڑیاں چونا گلی کی طرح کیچڑ اچھال کر پیادہ لوگوں کے سفید کپڑوں پر گل بوٹے بنا رہی ہیں۔ یہاں ایشیائی حاجت مندوں کی حاجت روائی کی جاتی ہے۔ اس علاقے کے بھٹیار خانے میں اپنی بھوک مٹانے میں بھی گھس

پڑا۔ بھینس نما بھنا گوشت، ارہر کی دال، مولی کا بھرتہ اور اچار ساتھ میں نان، جگہ بکواس ہونے کے باوجود کھانا بڑا مزے دار تھا۔ چالیس روپئے کا بل دے کر ڈکار لیتا باہر نکلا۔ ماشاء اللہ ایک بزرگ صورت پان بھی بیچ رہے تھے۔ لندن میں تقریباً تین سو ہوٹل صرف دیسی کھانے اور مغلیہ پکوان تیار کرتے ہیں۔ یہاں ہندستانی بازار میں پنجاب کا آٹا، دہرہ دون کے باسمتی چاول، پٹنہ کی سرخ مرچ اور علی گڑھ کا مکھن تک دستیاب ہیں۔

برمنگھم کے علاقے میں پاکستانی دکانیں ایک قطار سے ہیں۔ ان میں مٹھائی کی دکانیں خوب سجی ہوتی ہیں اور ترش رو قصاب کی جگہ شیریں کلام پاکستانی بیگمات گوشت کے نفیس پارچے بڑے ادب واحترام سے بیچتی ہیں۔ گویا اقبال کی ''بانگ درا'' سیل پر لگی ہو۔

سلطنتِ انگلشیہ میں اب تک وکٹوریہ رسوم وآداب کی انتہاپسندی کا چلن ہے۔ مگر یہ نخرے اب ہوٹل، ریستوران کی میز اور تھیٹر کی نشستوں تک محدود ہوگئے ہیں۔ امریکہ کے ہپی ترک وطن کر کے انگلستان میں ان رسوم وقیود کا بیڑہ غرق کئے ہوئے ہیں۔

بقول اکبر :

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھ
کٹی عمر ہوٹلوں میں ، مرے اسپتال جا کر

●●●

کتاب گھر کی پیشکش
http://www.kitaabghar.com
urdukutabkhanapk.blogspot.com

لندن کی نوٹنکی

ساون کی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ من پسند اور سستے ڈھابے نما ریستوران بند ہو چکے تھے۔ پبلک ٹیلیفون کلکتہ ٹیلی فون کی طرح کام کرنے کے موڈ میں نہ تھا۔ ہوٹل کا کرایہ اس برساتی سردی میں پسینہ چھڑا رہا تھا۔ اس بے کیف موسم میں، میں یا، کوئی بھی پھسڈی سیاح لندن میں پھنس جائے تو بس توبہ بھلی۔

ہاں اس موسم میں وقت گزاری کا طریقہ بھی ہے۔ کمرے میں بند ہو کر کوئی شغل فرمایئے یا V.C.R پر ہندستانی فلمیں دیکھئے یا پھر اگر ذوق تھیٹر والا ہو تو ڈرامہ کالم کی تلاش شروع کیجئے۔ اخبار کوئی بھی ہو اور کسی زبان کا ہو دیکھنے سے اندازہ ہو جائے گا۔ لندن میں تھیٹر آج بھی زندہ ہے۔ اگر آپ جانے کا موڈ بناتے ہیں تو انتخاب ایک مصیبت ہے کہ کون سا ڈرامہ دیکھا جائے ——— شافٹ بیری ایونیو کے کسی غلیظ تھیٹر پر اکتفا کیا جائے یا دریا پار کر کے نیشنل کے آرامدہ ایئر کنڈیشنڈ ہال میں خوش فعلیاں کی جائیں۔ اگر آپ جانا پسند کریں تو سن لیں کہ لندن کو Theatre Capital of the World کہا جاتا ہے۔

میراثیوں کی بستی کو دیکھنے کے لئے میں نے آکسفورڈ سرکس سے زمین دوز ریل کی سنٹرل لائن پکڑی اور آدھ گھنٹہ میں Notting Hill Gate پہنچ گیا۔ یہ علاقہ مختلف قومیتوں کا سنگم ہے۔ یہاں دلکش کتابوں، زمانۂ قدیم کی دست کاری کی دکانوں اور چھوٹے بڑے ریستورانوں کی بھرمار ہے۔ ایک ہندستانی نمائش کی تیاریاں بھی ہو رہی تھیں۔ کچھ سنیما ہال بھی ہیں مگر تھیٹر نام کی چیز نظر نہیں آئی۔ میں تیزی سے قدم اٹھاتا پیمبرج روڈ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ایک بہت ہی غیر شائستہ بار پر نظر رک گئی۔ اس کا نام ''دی پرنس البرٹ بار'' تھا اسکے گیٹ سے متصل ایک اور چھوٹا سا دروازہ تھا جس پر ''دی گیٹ تھیٹر'' The Gate theatre ایک بہت ہی پرانے بورڈ پر لکھا ہوا تھا۔ ایک تنگ سیڑھی اوپر جانے کا اشارہ کر رہی تھی۔ پہلی منزل پر ٹکٹ کاؤنٹر کی جگہ ایک لڑکا بیٹھا ٹکٹ دے رہا تھا۔ بس کلکتہ کے ''تصویر محل'' سنیما ہال پر ٹکٹ کی لائن کا سماں تھا۔ میں نے بھیڑ میں دھکا کھاتے ہوئے اپنے آگے والے صاحب سے پوچھا ''بھیا! آج ڈرامہ کون سا ہے'' کندھے اچکاتے ہوئے بھیا نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ پتہ چلا کہ کسی کو نہیں معلوم کہ آج کون سا شو ہے۔ یہی اس گیٹ تھیٹر کی خصوصیت ہے کہ ہر شو کو راز میں رکھا جائے۔

چونکہ اس تھیٹر کے شو بہت کامیاب ہوتے ہیں اسلئے نام کی کون پروا کرتا ہے۔ پبلک مطمئن ہے کہ جو ہوگا اچھا ہی ہوگا۔ اتنے میں موٹر سائیکل کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ دیکھا تو ایک مجھ سے بھی گیا گزرا جوان لدا پھندا بڑی تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ رہا تھا۔ سرگوشی ہوئی اور سنا کہ یہ ڈاکٹر لوسٹین Lou-Stein ہیں جو اس تھیٹر کے کرتا دھرتا ہیں۔

میں نے دو پاؤنڈ کا ٹکٹ لیا اور سر کھجاتا ایک بڑے سے کمرے نما ہال میں داخل ہوا اور ایک کونے والی شیشم کی لکڑی کے سٹول پر جم گیا۔ ہال چھوٹا ہونے کی وجہ سے ایک قسم کی گھٹن ہو رہی تھی۔ مختلف سستے اور مہنگے سینٹ کی خوشبو نے بھی فضا کو بوجھل کر رکھا تھا مگر پبلک بڑے صبر سے پردہ اٹھنے کا انتظار کر رہی تھی۔ خدا خدا کر کے پردہ اٹھایا گیا۔ اس وقت ڈرامے کا نام ''دی کرمسن آئی لینڈ'' The Crimson Island بتایا گیا جو روسی ڈرامہ نگار بلگا کو (Bulgakou) کا لکھا ہوا تھا۔ ۱۹۳۲ میں پہلی مرتبہ اسے روس میں پیش کیا گیا تھا مگر سنسر نے اس کی نمائش پر پابندی عائد کر دی تھی۔ آج پچاس سال بعد اس کا ترجمہ پوری کامیابی کے ساتھ لوسٹین پیش کر رہے تھے۔ میں ان ستر خوش قسمتوں میں سے تھا جنہیں آج سیٹ مل پائی تھی۔

بہت سے لوگ مایوس لوٹے تھے۔ مجھے اس شو نے بہت محظوظ کیا۔ دی گیٹ تھیٹر جا کر اندازہ ہوا کہ لندن میں تھیٹر نہ صرف زندہ ہے بلکہ پوری صحت مندی سے سانس لے رہا تھا۔ جگہ کی تنگی اور جدید تکنیک اور سہولتوں کی کمی نے اداکاروں کو کچھ زیادہ حساس اور متحرک کر دیا تھا۔ ان کی اداکاری میں سادگی اور مکالموں میں قوت تاثیر حد درجہ تھی۔ ان کا سوانگ تیز فہم مزاحیہ مگر پیشہ ورانہ تھا۔ کل یہ شور ہے نہ رہے مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر آپ خود کو لوسٹین جیسے منجھے ہوئے سنجیدہ ہدایت کار کے حوالے کر دیں تو آپ کو بلا مبالغہ ٹکٹ کی قیمت سے زیادہ ذہنی آسودگی فراہم کی جائے گی۔ حالانکہ لندن میں بیروزگاری قیاس سے باہر ہے اور خاص طور پر تھیٹر والوں کی حالت کلکتہ کی طرح خستہ ہے مگر دی گیٹ تھیٹر کے کارکنوں کا انداز نرالا ہے، نہ انہیں کسی دروازے سے امداد ملتی ہے نہ ہی انہیں طلب ہے۔ اپنے ہر شو کو چیلنج تصور کرنے والا یہ گروپ اپنے سوانگ کو تقدیس کا روپ دے کر بغیر اعلان کے شو کو ہاؤس فل کر لیتا ہے۔ لندن میں تھیٹر عوام کی ضرورت بن چکا ہے مگر ٹی وی ڈراموں نے اسٹیج شو کو خطرہ لاحق کر دیا ہے۔ ڈر ہے کہ ٹی وی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اسٹیج کو زندہ درگور نہ کر دے۔ آج کل روایتی طرز کے تھیٹر کو ایک خطرہ ورکنگ کلاس یا پھر سوشلسٹ تھیٹر سے بھی ہو گیا ہے۔

باکس آفس سے پرے چھوٹی کمپنیاں اور مختلف ڈرامہ بدوش گروپ جیسے The Brace and Belt Road Show Company وغیرہ نے تھیٹر کے احاطے سے نکل کر کلب، شراب خانے اور فیکٹری کیمپس اور راستہ کے کنارے اپنے شو اور کرتب دکھانا شروع کر دیتے ہیں۔ پکاڈلی سرکس اور ہائیڈ پارک میں ایسے منچلے گروپ کو دیکھ کر مجھے اپنے یہاں کے مداری اور نوٹنکی یاد آ گئی۔ ہائے میراثی اور اندر سبھا والوں کا کیا دور تھا۔ اب کہاں وہ اختر پیا۔ ان کی جگہ کوئی سیٹھ کروڑی مل ڈراموں کو ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ خیر سڑک چھاپ تماشے کو ولایتی عوام پسند کر رہے ہیں مگر سنجیدگی سے دیکھا جائے تو روایتی تھیٹر کے شوقین الگ ہی ہیں۔

ویسٹ اینڈ پر ایک تاریخی تھیٹر ہے Wyndham's Theatre اسے ۱۸۹۹ میں ایک مشہور اداکار سر چارلس دندھام نے بنایا تھا۔ یہ ایک اعلیٰ ذوق کا عظیم الشان ہال ہے۔ صدر دروازے پر چمچاتا پیتل کا منقش ہینڈل عہدِ ماضی کی جھلک پیش کر رہا ہے۔ سرخ دبیز قالین میں جوتے دھنستے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ میں خود کو اس شاہی ماحول میں فٹ نہیں کر پا رہا تھا۔ یہاں ڈرامہ ڈاریو فو کا تھا۔ Accidental Death of an Anarchist یہ ایک فارس تھا اطالوی سماج اور سیاست پر ایک بھرپور طنز۔ ایک سادہ لوح جوان کی کہانی جسے پولس اسٹیشن کی چار منزلہ عمارت سے کود جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ مکالموں کی روانی اور طنز کے نشتر بے حد کامیاب تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ برطانیہ عظمیٰ میں ایسے سوشلسٹ نعروں سے بھرپور سوانگ کی اجازت کیوں کر ملی اور وہ بھی اس روایتی ہال میں۔ سنا ہے کہ اب پورے گروپ کو کمیونسٹ ہونے کا خطاب دیا جا رہا ہے اسکے باوجود ڈرامہ ہاؤس فل جا رہا ہے۔ ''ہاف مون'' تھیٹر ایسی کسوٹی ہے جہاں تجرباتی ڈرامے پرکھے جاتے ہیں اور مندرجہ بالا اطالوی ڈرامہ پہلے اسی کسوٹی پر کسا گیا پھر ونڈھام میں پچھلے ایک سال سے تہلکہ مچائے ہوئے ہے۔ یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر سینٹ مارٹن تھیٹر ہے جہاں پچھلے اٹھائیس سالوں سے لگاتار ایک شو گاگا تھا کرسٹی کا ''دی ماؤس ٹریپ'' The Mouse Trap چل رہا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہال خالی رہتا ہے پھر بھی یہ شو زندہ ہے۔ پتہ نہیں کیوں اور کیسے؟ لندن والے کہتے ہیں کہ اگر آپ کچھ میوزک اور تھوڑا آرام کرنا پسند کریں تو اس شو کا ٹکٹ ضرور خریدیں۔

اب تک جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ لندن میں ضرور تھا مگر درآمد شدہ تھا۔ میں اب کچھ خالص ولایتی چیزیں دیکھنا چاہتا تھا۔ لفظ خالص کے ساتھ ہی دی نیشنل تھیٹر اور دی رائل شیکسپیئر کمپنی کا نام ذہن میں آ جاتا ہے۔ انہیں دیکھے بغیر لندن کے تھیٹر کو سمجھنا مشکل ہے۔ یہاں ''مرچنٹ آف وینس'' دیکھنے کا اتفاق ہوا تو بڑی کوفت ہوئی۔ جہاں تک مکالموں کی ادائیگی کا سوال تھا وہ لاجواب اور شیکسپیئرین ماحول بھی تھا مگر روایتی لباس، کاسٹیوم اور اسٹیج تکنک کی خامیاں کھل رہی تھیں۔ یہ شو مصری ممی کی طرح تھا جو تمام تر شاہی جلوہ گری کے باوجود بے جان ہوتی ہیں۔ یہاں روایتی تھیٹر کو زندہ رکھنے میں اتنی ہی صداقت رہ گئی تھی جتنی امریکہ کے ''ڈسنی لینڈ'' میں ہوا کرتی ہے۔ اتنا ضرور تھا کہ کرداروں میں ادب لازم و ملزوم تھا۔ لفظوں کی بندش اور اتار چڑھاؤ کے دھارے میں موسیقی، تکنیک اور ہدایت سب بہہ جاتے ہیں۔ ان مکالموں میں جادو کا سا اثر ہوتا ہے۔ برٹش ڈراموں میں مکالموں کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔ مگر مکالمہ اور روایت کے دوش پر ڈرامہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ ڈرامہ تو سماج کا ایک بلند بانگ نعرہ ہے۔ میری نظر

میں نیشنل تھیٹر اپنے اوپر روایتی جمود طاری کئے ہوئے ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میری رائے درست نہ ہو مگر یہ اتنا عالیشان اور فضول خرچ ہے کہ ایک نیشنل آرٹ کی یادگار ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے عظیم الشان ہال میں ڈرامہ کھو سا جاتا ہے۔ سیاح ڈرامے سے زیادہ اس کی منقش گیلری اور رنگین چھتوں، دبیز پردوں اور قیمتی قالینوں میں بھٹک کر رہ جاتا ہے۔ اس آرامدہ ایئر کنڈیشنڈ ماحول اور عطر بیز فضا نیز دلکش چہروں کے جھرمٹ میں بھی مجھے ''دی گیٹ تھیٹر کی تنگ کوٹھری نما ہال یاد آرہا تھا۔ یہ اپنا اپنا نظریہ ہے۔ اچھے ڈرامے کے لئے اچھا اور جدید ہال ہونا ضروری ہے مگر اچھے ہال کے بغیر بھی عمدہ ڈرامہ اسٹیج کیا جاسکتا ہے۔

لندن کی سیاحی میں رائل شیکسپیئر کمپنی کا دیکھنا از حد ضروری ہے۔ یہ اپنے عہد کے ابلاغ و روایت کا زندہ عجائب گھر ہے۔ اسی طرز کا ایک اور تھیٹر Aldwych Theatre ہے جہاں اکثر شیکسپیئر کے کارنامے دکھائے جاتے ہیں۔ ان دنوں چارلس ڈکنس کے ناول Nicholas Nickleby کی ڈرامائی تشکیل لندن میں کافی مقبول ہو رہی ہے۔ کچھ اور قابلِ ذکر ڈرامے شہر میں دکھائے جارہے تھے جن میں Hampstead Theatre میں ''مائیک لیج'' Mike Leigh کا ''گوز پمپلس'' Goose Pimples اور جان وبسٹر کا The Dutchess of Malfi بھی خوب ہے جس میں معروف اداکارہ ہیلن میرن Helen Mirren کی عمدہ پرفارمنس بطور ڈیوک کی بیگم یادرہے گی۔

میں نے خوب سیر ہو کر لندن کی نوٹنکی، تھیٹر اور میراثیوں کو دیکھا اور ملاقات کی۔ اسی تگ و دو میں اگر کسی کی یاد آئی تو اپنے نوٹنکی والے یار ظہیر انور کی۔ ظہیر نہ صرف میرے کلکتے کے رنگ منچ کا ساتھی ہے اور ایک گمبھیر قسم کا ڈرامہ نویس بلکہ خود ایک ڈرامہ ہے۔ کاش ہم ساتھ ہوتے۔ خوب نوک جھونک ہوتی، بحث و مباحثہ شو کے درمیان ہوتا۔ نئی چیزیں ہم سیکھتے اور اچھی چیزیں انہیں سکھاتے مگر ایسا نہ ہوسکا۔ ساتھ ہی مجھے ساقی فاروقی سے ملاقات کرنی تھی۔ افتخار عارف اور زہرہ نگاہ سے غزلیں سننی تھیں، احمد فراز سے ان کی بن باسی نظمیں سننی تھیں اور اردو مرکز پر حاضری دینی تھی کہ حضرت ملک زادہ منظور احمد کا حکم تھا مگر اس کا وقت ہی نہ ملا۔ لندن کے شاہی ریلوے اسٹیشن سے انوکھا B.B.C کے ریڈیو اسٹیشن بھی جانا نہ ہوا گو کہ دو دفعہ فون پر اطلاع دی کہ تیار ہو جاؤ کہ میں آیا چاہتا ہوں!

یہ تمام بیکار وضع داریاں با کار نوٹنکی کی نذر ہو گئیں۔ پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ امریکہ سے واپسی پر اسی بہانے ایک بار پھر اپنے پرانے آقاؤں کے دیس میں حاضری دیں گے۔

●●●

نیویارک مہاجرین کی جنت/ دوزخ

جس طرح شہر آگرہ کو تاج محل اور پیرس کو ایفل ٹاور سے لوگ جانتے ہیں اسی طرح نیویارک کو ''آزادی کی دیوی'' Statue of Liberty سے پہچانا جاتا ہے۔اس شہر چراغاں کے بارے میں ہر شخص کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہے مگر میری طرح شاید آپ کو بھی نہ معلوم ہو کہ آج کے شہر نیویارک کی بنیاد سترہویں صدی عیسویں کے آغاز میں ولندیزیوں کے ہاتھوں پڑی اور اس کالونی کو نیو امسٹرڈام کہا جاتا تھا!

نیویارک شہر ٹکڑوں میں جزیروں پر آباد ہے اور پانچ بڑے حصوں یا علاقوں میں بٹا ہوا ہے۔ برکلن، کوئنز، رچمنڈ، برانکس اور منہاٹن۔ یہ حصے یا علاقے، جزیرے یا جزیروں کے خوبصورت حصے ہیں۔ان میں سب سے خوبصورت منہاٹن Manhattan ہے جو ایک لانبا اور مکمل جزیرہ ہے مگر پلوں اور ٹیوب ویل کے ذریعہ دیگر علاقوں سے ملا ہوا ہے۔

جب میں جان ایف کینیڈی J.F.K ایئرپورٹ پر اترا تو فضا میں خاصی خنکی تھی نیویارک کو جانے والو کان کھول کر سن لو کہ اس دلگیر ہوائی اڈے پر تمام جدید ترین سہولتوں اور ایمرجنسی سروس کے علاوہ مین لابی کے آس پاس زرد لباس اور کج کلاہ میں گولڈن گرل لکھی ہوئی پٹی باندھے تیز طرار شوخ بچیاں آپ کے استقبال و رہنمائی کے لئے مخصوص ہیں۔ یہ آپ کے الٹے سوالوں کے سیدھے جواب دینے کے لئے بے چین ہیں۔ ذرا ر کو اور انہیں غیر نہ جانو۔ان کی قدر کرو اور ان کی ڈیوٹی فری مسکراہٹوں سے سفر کی تکان اتارتے جاؤ۔

میں اپنے بے جا اپنے سامان لئے سیاح سے زیادہ قلی لگ رہا تھا کیونکہ ہماری تہذیب میں سامان کے وزن سے ہی سیاح کی جہاں گردی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مجھے اپنی تہذیب و ثقافت بڑی عزیز ہے۔اس کا بھرم قائم رکھنا میرا فرض تھا۔ خیر۔ایک گولڈن گرل، سنہری گائیڈ نے ایک بھرپور غلط نگاہ سے میرا ایکسرے کر ڈالا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا مجھے انگلی کے اشارے سے بتایا کہ سیدھے چلے جائیں اور JFK ایکسپریس آپ کو شہر پہنچا دے گی۔ میرے لئے مزید بکواس کرنے کے مواقع نہیں تھے میں شکریہ ادا کرتا ہوا سیدھا چل پڑا۔

جہاز نے سیدھا پہلی منزل پر اتارا تھا۔ پانچ منٹ میں ہم جے ایف کے ایکسپریس تک پہنچے۔ایئرپورٹ پر ہی ایک بڑے بورڈ پر برقی قمقموں سے لکھا تھا I Love Newyork راستے میں ہر سیاح کے کالر یا جیب پر لیبل اور بٹن میں بھی یہی قصیدہ کندہ تھا۔اس کے علاوہ یہ نعرہ پوسٹر، گلاس، مشروبات کے کین اور پیپرویٹ پر بھی چھپا ہوا تھا۔مزے کی بات یہ تھی کہ صرف سیاح ہی نہیں بلکہ مقامی لڑکیاں اور لڑکے بھی اس شہر سے اپنی محبت کا اظہار اس خوبصورت اعلان سے کرتے ہیں۔

میں زمین روز ریل جے ایف کے ایکسپریس سے تقریباً چالیس منٹ میں کوئنز کے علاقے میں کیو گارڈن پہنچا۔ یہاں میں ڈاکٹر طارق کا مہمان تھا۔ مجھے م۔نسیم صاحب نے بھائی قمرالدین کے پاس بھیجا تھا مگر انہوں نے مجھے طارق صاحب کے سر لا دیا۔حسن اتفاق کہ ڈاکٹر میری طرح شریف اور داڑھی والے تھے اس لئے مجھ سے بہت بے تکلف ہو کر ملے۔ رات کے نو بجے سردی کے باوجود گرم پانی کا شاور لے کر میں نے سفر کے غبار کو خود سے الگ کیا۔ مجھے ایسا لگا ڈاکٹر میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔ لاہور کے لوگوں کو میں اتنا مہمان نواز نہیں سمجھتا تھا جتنا طارق صاحب نکلے، وہ پکے افسانوی طرز کے عرب مہمان نواز لگتے تھے۔ زندہ دل مگر اوپر سے سنجیدہ۔مزے کی بات یہ ہے کہ حضرت کھانا خود پکاتے اور خوب پکاتے۔ خدا نے ان کے ہاتھوں میں شفا دی ہے یا نہیں پتہ نہیں مگر مزا ضرور دیا تھا میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ ڈاکٹری کے جھمیلے میں نہ پڑتے تو کسی فائیو اسٹار ہوٹل

کے نعمت کدے کے مائی باپ ہوتے۔قسمت کی ستم ظریفی یا پھر والدین کی ضد کہ ڈاکٹر بن گئے کیوں کہ ہمارے یہاں بچوں کو اپنا مستقبل یا کیریئر کے انتخاب کا حق کہاں دیا جاتا ہے۔ جتنے دین دار اسی قدر ادب دوست۔ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جناب شعر سننا اور پوری غزل برداشت کرنا اپنی میزبانی کی اولین شرط سمجھتے تھے۔انہوں نے میرے ساتھ گھومنے میں بہت کم وقت دیا مگر گھر سے ہی مجھے ڈائرکشن دے کر روانہ کرنے اور واپسی تک کھانے پر میرا انتظار کرتے۔ان کے سرائے نما فلیٹ میں صرف میں ہی روٹی نہیں توڑ رہا تھا بلکہ میری گریڈ کے اور ساتھی بھی اکثر محفلیں گرم کرتے رہتے۔کھانے کے بعد شعری نشستیں ہوتیں اور خوب واہ واہ ہوتی۔

امریکی اقتصادیات میں نیویارک کو کلیدی پوزیشن حاصل ہے۔اس کا شمار مصروف ترین بندرگاہوں میں ہوتا ہے۔ یہ صنعت و حرفت کا ہیڈ کوارٹر اور نشریات مطبوعات، فیشن اور اشتہار سازی، بینکنگ ایکسپورٹ وامپورٹ کا مرکز ہے۔

میں سب سے پہلے یہاں کی سب سے قدیم اور تاریخی یادگار ''آزادی کی دیوی'' Statue of Liberty دیکھنا چاہتا تھا۔ پتہ چلا کہ گھنٹہ بھر ''سب وے'' زمین دوز ریل سے سفر کرنے کے بعد موٹر لانچ سے لبرٹی آئی لینڈ جانا پڑے گا۔وہاں سمندر کے بیچ یہ یادگار آباد ہے۔ میں بتائے ہوئے طریقے سے جائے وقوع تک پہنچا۔دور ہی سے یہ مجسمہ نظر آ رہا تھا۔آزادی کا یہ نشان بڑا شاندار لگ رہا تھا۔ نیلے سمندر میں پتھر کا یہ مجسمہ اور اوپر صاف آسمان ایک عجیب منظر تھا۔ مجھے دور ہی سے اندازہ ہوا کہ یہ کافی بڑا اور اونچا مجسمہ ہوگا مگر جوں جوں موٹر لانچ جزیرے سے قریب ہوتا گیا آنکھیں حیرت سے پھیلتی گئیں مجسمہ میرے اندازے سے کافی اونچا تھا۔ جیسے ہی لبرٹی آئی لینڈ میں قدم رکھا تو کھلی فضا میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ ہرا بھرا چھوٹا سا یہ جزیرہ غیر آباد نہ تھا۔آزادی کی دیوی ہمارے سامنے بڑی شان سے ایستادہ تھی۔اسے دیکھے بغیر اسکے قد و قامت کا اندازہ مشکل ہے۔یہ مجسمہ زمین سے تین سو چھ فٹ ایک انچ اونچا ہے۔صرف مجسمے کا قد ۱۵۱ فٹ اونچا ہے۔اس کا وزن ۴۵۱,۰۰۰ پاؤنڈ ہے۔اس کا داہنا ہاتھ اٹھا ہوا ہے اور ایک مشعل لئے ہوئے ہے۔اس ہاتھ کی لمبائی ۴۲ فٹ ہے۔اس کے سر پر ایک تاج ہے جس میں ۴۱ر آدمی کھڑے ہو سکتے ہیں۔ ایک آنکھ سے دوسری آنکھ کے درمیان دو فٹ کا فاصلہ ہے۔اس کی ناک چار فٹ ساڑھے چھ انچ لمبی ہے جو شاید دنیا کی سب سے لمبی ناک ہے۔منہ کی چوڑائی دو فٹ گیارہ انچ ہے۔ بائیں ہاتھ میں ایک لوح تھامے ہے جس کی لمبائی ۲۳ فٹ چھ انچ اور چوڑائی تیرہ فٹ چھ انچ ہے۔یہ لوح و مشعل آزادی کے اعلان کی علامت ہے۔اس دم کشیدہ عظیم الشان یادگار کو فیڈرک اگسٹی بارتھولڈی Fedric Auguste Bartholdi نامی سنگتراش نے تیار کیا اور یہ بے نظیر تحفہ فرانسیسی عوام کی طرف سے متحدہ امریکہ کے عوام کو ۲۸ر اکتوبر ۱۸۸۶ء میں نذر کیا گیا تھا۔

کولمبس نے امریکہ کو دریافت ضرور کیا تھا مگر اس سے پہلے نیویارک کا انکشاف جیوانی ورازانو نامی اطالوی نے کر لیا تھا ساتھ ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ایک انگریز ماہر جہاز ران کو مامور کیا گیا کہ وہ مشرق کا آسان بحری راستہ معلوم کرے۔اس کھوج میں ہنری ہڈسن نے نیویارک کے ساحل کا پتہ لگایا جو بعد میں امریکہ کا سب سے بڑا اور مصروف ترین بندرگاہ بنا اور آج اس دریا کو ہڈسن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

۱۶۹۰ء میں نیویارک کی آبادی صرف ۴۰۰۰ تھی۔ رفتہ رفتہ اس بندرگاہ پر جہازوں کی بھیڑ رہنے لگی اور ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں یورپ اور دیگر خطوں سے مہاجرین اس فردوس گمشدہ کو بسانے آنے لگے۔۱۸۸۲ء سے ۱۹۵۴ء کے درمیان ایک کروڑ ساٹھ لاکھ مہاجرین ایلس آئی لینڈ Ellis Island کے راستے سے اس زرخیز ساحل پر آئے۔ مئی ۱۹۵۴ء میں یہ سلسلہ منقطع کر دیا گیا مگر کسی نہ کسی طرح ہجرت کا سلسلہ اب تک جاری ہے لیکن اب یہ جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہیں۔مجسمہ آزادی ایک ستارہ نما قلعہ پر ایستادہ ہے۔اسکے دامن میں مہاجرین کا ایک عجائب گھر آباد ہے۔ یہ عجائب گھر امریکہ میں بسنے والے مہاجرین کی دلچسپ داستان اپنے اندر محفوظ کئے ہوئے ہے۔ ہزار ہا تارکین وطن نے کس طرح اپنی زمین کو چھوڑ کر متحدہ امریکہ کی قسمت کو سنوارا اور ایک نئی دنیا کی کھوج میں وہ اپنے ساتھ اپنی پرانی تہذیب، ساز و سامان اور اپنا ماضی بھی لائے۔ اس مخلوط تہذیب و ثقافت نے ایک نئی تہذیب اور برادری کو جنم دیا اور وہ کامراں و شادماں ہمارے سامنے ہے۔

●●●

فلک بوس عمارتوں کا جنگل

آج جمعہ کا دن تھا۔ میں چند علیگ ساتھیوں سے ملتا ہوا جمعہ کی نماز کے لئے فلشنگ کے اسلامک سنٹر پہنچا۔ تقریباً چالیس مومن نماز کے لئے جمع تھے۔ اللہ کو یاد کر کے اٹھنا چاہ رہا تھا کہ سامنے کی صف پر ایک لمبی شیروانی میں ملبوس بزرگ کو دیکھا۔ حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جناب نادر علی خان ،لکچرار شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جلوہ فگن تھے۔ ساتھ ہی ڈاکٹر ثناء اللہ بھی تھے۔ ان کے ہمراہ کچھ ہندستانی مسلم دعوتِ دین کے سلسلے میں امریکہ آئے ہوئے تھے۔ نادر صاحب میرے استاد رہ چکے ہیں۔ بہت پہنچے ہوئے اللہ والے ہیں۔ علی گڑھ کے زمانے میں ہم لوگ ان سے بہت بھاگتے تھے کہ حضرت چلہ پر نہ ساتھ لے جائیں اور حسن اتفاق کہ حضرت میرے پیچھے امریکہ تک آ گئے۔ اس کو کہتے ہیں شاگرد کی فکر! ان بزرگوں سے مل کر سچی خوشی ہوئی اور دل ہی دل میں اپنا احتساب کر ڈالا مگر ہائے رے کمبختی جب حضرت نے امید کے مطابق ساتھ چلنے کو کہا تو نادان دل نہ مانا اور مصافحہ ہی میں تسلی کر لی۔ ساتھ ہی گلو خلاصی یا پھر رشوت کے طور پر چند تازہ دم اور کہنہ مشق علیگ مومنوں کا پتہ چپکے سے بتا کر میں وہاں سے رخصت ہوا۔

سب سے پہلے میں نے Mc Donald کو ڈھونڈا۔ کچھ ہی فاصلے پر یہ فاسٹ فوڈ ریستوران مل ہی گیا۔ وہاں فش فیلے اور سلاد پر اکتفا کر کے قریب کے Subway زمین دوز ریل کا ٹوکن لیا اور سیدھا منہاٹن کا رخ کیا۔ ریل دوپہر کی وجہ سے بھری ہوئی نہ تھی تقریباً تیس منٹ گاڑھی اندھیری سرنگ سے گزرتی رہی۔ میرے سامنے والی سیٹ پر کچھ سیاح آپس میں باتیں کر رہے تھے اور ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ ہم لوگ East River کے نیچے سے گزر رہے ہیں۔ پتہ چلا کہ ریل دریا کی تہہ کے نیچے بنی ہوئی سرنگ کے اندر دوڑ رہی ہے۔ کچھ لمحے کو یقین نہ آیا۔ میری سامنے والی لڑکی بھی حیرت میں تھی مگر پتہ چلا کسی کسی زمین دوز اسٹیشن میں تین منزلہ پلیٹ فارم تلے اوپر بنے ہیں یعنی تین منزلہ اوپر کی جگہ تین منزلہ نیچے اترتے چلے جائیں۔ جب یہ ممکن ہے تو پانی کی تہ میں ریل دوڑانا کیا مشکل ہو سکتا ہے۔

کنڈکٹر نے ففتھ ایونیو کا اعلان کیا اور ہم امریکن ترقی کا قصیدہ پڑھتے ریل سے اتر گئے۔ اوپر راستے پر آئے تو گنجان آبادی رواں دواں تھی۔ منہاٹن خالص کاروباری علاقہ ہے۔ یہاں کی رونق کچھ اور ہی ہے۔ خاص طور پر سہ پہر تک جب بجلی کے تمام سائن بورڈ جل اٹھتے ہیں تو اس کی منظر کشی کرنا ممکن نہیں ہے۔ ففتھ ایونیو پر دنیا کے امیر ترین لوگ شاپنگ کرتے ہیں اور نیویارک کے امیر ترین لوگ رہتے ہیں۔ اسی ایونیو پر ٹرمپ ٹاور (Trum Tower) جیسی قابلِ دید عمارت ہے۔

یہیں Fifth Ave.Saks اسٹور دیکھا ساتھ ہی Cartier کے اسٹور میں سونے اور پلاٹینم کی گھڑیاں ٹک ٹک کرتی دیکھیں۔ قیمت اس لئے نہیں پوچھی کہ میں خریدنے کے موڈ میں نہ تھا۔ کچھ ہی دوری پر گرانڈ آرمی پلازا ہے۔ یہاں عالی شان پلازا ہوٹل اسکے برعکس پیرس تھیٹر میں ششی کپور کی فلم Heat & Dust کی لائن لگی ہوئی تھی۔ پلازا کے فوارے کے سیدھ پر ایک بڑا پارک نظر آ رہا تھا۔ یہ سنٹرل پارک تھا۔ نیویارک کے کانکریٹ جنگل کے بیچ یہ ۸۴۰ ایکڑ کا سبزہ زار کسی لق و دق صحرا کے بیچ ہرے بھرے نخلستان کی طرح تھا۔ اس پارک میں پہاڑیاں، چھوٹے تالاب، بچوں کے لئے ایک چھوٹا سا چڑیا خانہ، طرح طرح کے پھول پودے اور جھاڑیاں، اوپن ایئر تھیٹر، ریستوران، آئس کریم پارلر، آئس اسکیٹنگ رنگ، بوٹنگ وغیرہ کے ساتھ لوگ جن میں مقامی باشندے اور سیاح دونوں اپنی صحت کا خیال رکھ رہے تھے یعنی کچھ لوگ دوڑ رہے تھے، کچھ بچوں کے ساتھ

پتنگ اڑا رہے تھے، چند سائیکل چلا رہے تھے اور کچھ کشتی چلا رہے تھے۔ ایک بات جو مجھے اچھی لگی وہ یہ تھی کہ اس شہر میں تمام مشینی بھاگ دوڑ کے باوجود لوگ اپنی صحت کا خیال رکھ رہے ہیں۔ ہماری تہذیب اور شہری زندگی میں صحت کو یا Exercise کو ایک خاص ڈبے میں بند کر دیا گیا ہے یعنی کسرت جسمانی دیکھ بھال صرف خاص جگہ یا خاص وقت پر ہوسکتی ہے۔ صبح اٹھنے میں اگر دیر ہوگئی تو دوڑ نا منع ہے مگر یہاں اس مشینی زندگی میں لوگ صحت کی طرف سے غافل نہیں ہوتے جس کو جب موقع مل جائے دوڑتا نظر آئے گا۔ اس میں صبح وشام کی قید نہیں۔

تجارتی ذہنوں نے جسمانی دیکھ بھال کو ایک خاص اہمیت دے کر نئے نئے زاویے دریافت کر لئے ہیں۔ اب یہاں ہر علاقے میں Aerobic Dance Club کھل گئے ہیں جن میں مختلف رقص اور موسیقی کے ذریعہ صحت کا خیال رکھا جا رہا ہے۔ ٹی وی پر بھی اس کے بہت سے شو ہوتے ہیں۔

سنٹرل پارک کے اوپن ایئر تھیٹر میں مہمان فن کار اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ سنا پچھلے ماہ استاد اللہ رکھا طبلہ نواز کا شو تھا جو بہت پسند کیا گیا تھا۔ یہیں ہر سردی میں شیکسپیئر فیسٹیول بھی منعقد ہوتا ہے۔

سن سن کرتے ہم سنٹرل پارک سے باہر نکلے۔ چہل قدمی کرتے ٹائم اسکوائر کی طرف بڑھنے لگے۔ راستے میں سینٹ پیٹرک کا عظیم الشان گرجا ایستادہ تھا۔ اس راستہ پر سینٹ پیٹرک ڈے کی زبردست پیریڈ نکلتی ہے اور پورے نیویارک اور گردونواح کے آئرش Irish سبز جھنڈیاں لہراتے جمع ہوتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں ہم ٹائم اسکوائر پر کھڑے تھے۔ یہاں ہر نسل و رنگ کے لوگ اپنے آپ میں مست آوا گون میں مصروف تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک فلک بوس عمارتیں حد نظر تک پھیلی ہوئی تھیں مگر عمارتیں جتنی اونچی اخلاق اتنا ہی پست۔ فٹ پاتھ پر کھلے عام جوا اور قمار بازی چل رہی تھی۔ یہ خاص تجارتی علاقہ ہے۔ جتنا سامان بڑے اسٹوروں میں سجا ہے اتنا ہی فٹ پاتھ پر لگا ہے۔ ڈالے اور خوانچہ والے بھی دنیا بھر کی نعمت با آواز بلند بیچ رہے ہیں۔ ان میں مصری اور یمنی لڑکے پھل اور کھانے کی چیزیں سیخ کباب بیچ رہے ہیں تو سوڈانی کالے گھڑیاں اور دیگر چیزیں بیچ رہے ہیں۔ ہندستانی اور پاکستانی لڑکوں کو بھی دیکھا۔ یہاں ہر طرح کا کاروبار منافع بخش ہے۔ کھوے سے کھوا چھلتا محسوس ہوتا ہے مگر چھلتا نہیں۔ ٹائم اسکوائر کے فٹ پاتھ پر کلکتے کی یاد بے اختیار آئی۔ بھیڑ میں ٹھیلے والے، رنگ برنگی چہرے، مداری، جاز ڈرم بجاتے اور بریک ڈانس کرتے کالے سیاہ فام لڑکے، کولہے مٹکاتی کالی گوری اور اسپینش بچیاں، چرس کی سگریٹ بیچتے سرخ رو اور گھنگھریالے لڑکے ان تمام Passing Show فلم کی ریل کی طرح چلتے منظر پر کلکتے کا گمان ہوتا ہے مگر جب نظر فٹ پاتھ سے اوپر اٹھتی ہے اور ہزاروں بلکہ لاکھوں واٹ کے جگمگاتے ہوئے بجلی کے قمقموں اور روشنی کے سیلاب پر نظر پڑتی ہے تو خیال آتا ہے کہ یہ کلکتہ نہیں نیویارک ہے۔ کلکتہ اور بجلی یہ چند دہائی پہلے کی دہائی تھی۔

میں نے گھڑی دیکھی تو دوپہر کے تین بجا چاہتے تھے۔ سڑک پار فورٹی سیکنڈ اسٹریٹ (4 2nd Street) دعوت نظارہ دے رہی تھی۔ اس پرستان کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا مگر اس وقت مجھے منہاٹن کے آخری سرے پر کھڑی ورلڈ ٹریڈ سنٹر تک جانا تھا۔ میں نے بس پکڑی اور W.T.C سے ایک اسٹاپ پہلے اتر گیا۔ یہاں کباڑیوں کا ایک مینا بازار ہے جسے جاب لاٹ کہتے ہیں جو تقریباً ڈیڑھ دو فرلانگ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس بازار میں دنیا کی تمام نعمتیں دستیاب ہیں اور کم قیمت پر اتنا سامان دیکھا کہ کچھ بھی خریداری نہ ہوئی۔ کچھ ہی فاصلے پر ورلڈ ٹریڈ سنٹر تھا۔ اسے دیکھنے کے لئے زرافے کی گردن چاہئے۔ اس وقت یہ نیویارک کی سب سے اونچی عمارت ہے اور یہ جڑواں عمارتیں ۱۱۰ منزلہ اونچی ہیں۔ یہ زمین سے ۱۳۵۰ فٹ اونچی ہے۔ اس کی تعمیر کا کام ۱۹۶۶ء میں شروع ہوا اور ۱۹۷۶ء میں پایہ تکمیل تک پہنچا۔ اسے عالمی تجارت کے مرکز کے طور پر نیویارک پورٹ اتھارٹی نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کی ۱۰۷ ویں منزل پر نیویارک کو دیکھنے کا Observation Desk بنا ہوا ہے جو شیشے سے ڈھکا ہوا ہے۔ اگر موسم اجازت دے اور آپ کا دل مضبوط ہو تو کھلی چھت سے افق کے پار جھانکا جا سکتا ہے۔ اوپر جانے کے لئے تین ڈالر کا ٹکٹ مطلوب

ہے۔اس کی زیارت کے لئے ہر وقت لمبی لائن لگی رہتی ہے۔میں بھی لائن میں لگ گیا۔میرے آگے صرف پچاس افراد کھڑے تھے اس دوران میں نے انکوائری کاؤنٹر سے ایک معلوماتی کتابچہ لیا اور مطالعہ کرنے لگا۔آیئے آپ بھی پڑھیں۔ یہ فلک شگاف عمارت ایک عجوبے سے کم نہیں۔اس بلڈنگ میں ۱۱۰۰ تجارتی دفاتر، سفارت خانے، ورلڈ ٹریڈ انفارمیشن سروس اور متحدہ امریکہ کی کسٹم اور ایکسپورٹ امپورٹ فرم موجود ہیں۔ان دفاتر میں کام کرنیوالوں کی تعداد روزانہ ۵۰,۰۰۰ ہے اور تقریباً ۸۰,۰۰۰ سیاح روانہ یہاں سیر کو آتے ہیں اور تین ڈالر کا ٹکٹ لے کر افق تک تفریح کرتے ہیں۔

یہ جڑواں عمارتیں بغیر کھمبے کے سیدھی کھڑی ہیں اور ان کا پورا احاطہ ۹۰۵ ملین اسکوائر فٹ زمین اپنے دامن میں سمیٹے ہے۔اس عمارت میں ۴۳۶۰۰ کھڑکیاں اور پوری عمارت میں ۱۶,۰۰,۰۰۰ اسکوائر فٹ شیشہ استعمال ہوا ہے۔اس کی زمین دوز پارکینگ میں بیک وقت دو ہزار گاڑیاں کھڑی ہوسکتی ہیں۔سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز اس عمارت کی لفٹ سروس ہے۔اوپر جانے کے لئے ۷۲ لوکل ایلی ویٹر ہیں جو یہاں کے کام کرنے والوں کے لئے ہیں۔چار دیو قامت بوجھ لے جانے والی لفٹ ہیں مگر سیاحوں کے لئے خاص ۲۳ لفٹ جنہیں تیز رفتار ایکسپریس کا رکھتے ہیں۔اس کی رفتار ۱۶۰۰ فٹ ایک منٹ میں طے کرتی ہے یعنی اوپر ۱۱۰ منزل تک جانے میں ایک منٹ بھی نہیں لگتا۔میں بڑی حیرت سے اس عجیب و غریب انسانی کرشمہ کو دیکھ رہا تھا کہ میرا نمبر آ گیا۔ٹکٹ لے کر میں ایک بڑے کمرہ نما کمپیوٹر سے چلنے والی لفٹ میں داخل ہوا۔تقریباً تیس مرد و زن اور بچے میرے ساتھ تھے۔دروازہ خود بخود بند ہوا اور خود ہی یہ لفٹ چل پڑی۔میں دروازے کے اوپر لگی پٹی کو دیکھ رہا تھا جہاں صفر کے بعد سید ھا دس کا ہندسہ آیا پھر بیس، تیس، چالیس، اب میں سمجھا کہ ہم لوگ دس منزل ایک ہی جست میں پھلانگ رہے تھے اور یہ لیجئے ایک سو ساتویں منزل پر لفٹ رک رہی تھی۔دروازہ خود بخود کھلا اور میرا منہ حیرت سے کھلنے لگا۔میرے ساتھ دیگر سیاحوں کے منہ سے بھی ایک سرد اور لمبی آہ نکلی۔زیادہ تر عورتیں اپنے سینے پر ہاتھ رکھے ہوئے تھیں۔خدا خدا کر کے ہم باہر آئے۔ایک کشادہ ایئر کنڈیشنڈ شیشے کے پنجرے میں ہم لوگ بند تھے۔دور افق کے کنارے صاف نظر آ رہے تھے۔نیچے لوگ چیونٹی سے چھوٹے لگ رہے تھے۔رنگ برنگی گاڑیاں پارے کے قطرے کی طرح پھسلتی محسوس ہو رہی تھیں۔پورا نیو یارک عمارتوں کا ایک گھنا جنگل لگ رہا تھا۔بڑی بڑی دوربینیں لگی ہوئی تھیں۔دس سینٹ کا سکہ ڈال کر اس کے ذریعہ بھی دیکھا۔آزادی کی دیوی اب تک مہاجروں کو امریکہ آنے کی دعوت دے رہی ہے۔جارج واشنگٹن پل ماچس کی تیلی لگ رہا ہے۔صاف شفاف آسمان حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا ہے۔نیچے دور تک نیلا دریائے ہڈسن بہہ رہا ہے۔پتہ نہیں کب شام ہوگئی اور ہم اختر شماری کرنے لگے۔سامنے ایک خوبصورت کیفے میں ایک بورڈ پر لکھا ہوا ہے ''برائے کرم ہاتھ بڑھا کر ستاروں کو نہ چھوئیں'' اس اعلان سے خوش ہو کر میں کافی خریدنے پر آمادہ ہو جاتا ہوں۔یہاں کیفے کے علاوہ چند گفٹ اسٹور بھی ہیں۔دیواروں پر W.T.C کی پوری تاریخ کندہ ہے۔ایک طرف ایک اور شاندار بورڈ لگا ہے کہ ''ہماری عمارت اتنی اونچی ہے کہ آپ میں سے جو چاہے اپنی مرضی سے جنت میں داخل ہوسکتا ہے'' میں اس حال میں جنت میں داخل ہونے سے تو رہا مگر قریب سے دیکھ لینے میں ہرج بھی نہیں اس لئے ایک اور لفٹ سے ۱۱۰ منزل والی کھلی چھت پر آ گیا۔خدا کی شان سیکڑوں ستارے کھلے آسمان میں جگمگا رہے تھے۔فضا میں ایک عجیب سکون اور خنکی تھی۔ایسا لگ رہا تھا کہ ایک دبیز سیاہ قالین پر کسی ماہر کاریگر نے بڑے قرینے اور پیار سے سلمہ ستارے ٹانک دیئے ہیں۔کچھ ہی دیر میں سردی نے پریشان کرنا شروع کیا اور ہم نیچے اترنے لگے۔۸۶ منزلہ پر رکے۔یہاں عالمی تجارت، درآمد برآمد کے سلسلے میں کمپیوٹر کے ذریعہ پوری دنیا سے چھ لاکھ پچاس ہزار سوالوں کے جوابات کا انتظام ہے جسے الیکٹرانک ڈاٹا پول سروس کہتے ہیں۔۵۵ منزلہ پر سکول آف انٹرنیشنل ٹریڈ آباد ہے۔۴۳ منزلہ پر پریس کانفرنس اور سیمینار وغیرہ ہوتا رہتا ہے۔جب میں سڑک پر آیا تو سر بھاری تھا۔اس علاقہ میں Wall Street اسٹاک ایکسچینج اور فیڈرل ریز روبینک ہیں۔

دوسری صبح بڑی خوشگوار تھی۔میں جزیرہ منہاٹن کو نئے ڈھنگ سے دیکھنے کے لئے فورٹی سیکنڈ اسٹریٹ پر بنی ایک بندرگاہ پر آیا اور بارہ ڈالر

کا ٹکٹ لیکر ایک Circle Line والے موٹر لانچ پر سوار ہو گیا۔ یہ دریائے ہڈسن کی سیر کرتا کوئی چار گھنٹے میں جزیرہ کا طواف کرتا رہا۔ ایک نوجوان گائیڈ عرشے پر مائیک لئے گزرتی ہوئی عمارتوں کے بارے میں انگلش اور فرنچ میں بتا رہا تھا۔ ہم ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اسکے بعد مشہور برکلن پل کے نیچے سے گزرے۔ پل پر کھڑے مقامی لوگ ہاتھ ہلا کر سیاحوں کا استقبال کر رہے تھے۔ اب نظر کے سامنے امپائر اسٹیٹ بلڈنگ ہے جو ففتھ ایونیو پر کھڑی ہے۔ یہ ۱۰۲ منزلہ عمارت اب تک ۵,۸۰,۰۰۰ سیاحوں سے اپنے رجسٹرڈ پر دستخط کرا چکی ہے۔

اس کی چھت پر ۲۲۲ فٹ اونچا ٹی وی انٹینا لگا ہوا ہے جو نیویارک کے ۲۰ ٹی وی اسٹیشنوں کے کام آتا ہے۔ یہ عمارت یکم مئی ۱۹۳۱ء کو تیار ہوگئی تھی۔ نظر کے سامنے اب اقوام متحدہ (U.N.O) ہے۔ یہ چار عمارتوں پر مشتمل ہے جن میں سب سے بڑی سنگ مرمر کی بنی ہوئی سکریٹریٹ بلڈنگ ہے۔ اس کے پیچھے لائبریری، اس سے متصل جنرل کانفرنس بلڈنگ اور سیکوریٹی کاؤنسل ہے۔ مختلف زبانوں میں جیسے انگریزی، فرنچ، ہسپانوی، روسی، چینی، عربی، اردو اور ہندی میں سیاحول کو تفصیلات بتائی جاتی ہیں۔ جنرل اسمبلی میں ۶۲۶ نشستیں صحافیوں کے لئے اور ۸۰۰ سیاحوں کیلیئے ہیں۔ گائیڈ اب ہمیں یانکی اسٹیڈیم کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ۱۸/اپیل ۱۹۲۳ کو اسکا افتتاح ہوا اور یہ امریکہ کا سب سے مصروف کھیل کا اکھاڑہ ہے۔ ۱۹۷۶ میں دوبارہ اس کی توسیع کی گئی۔ اب ہمارے سامنے ڈاؤن ٹاؤن کی سکائی لائن۔ بیٹری پارک، پین ایم بلڈنگ، کورنل میڈیکل سنٹر، نیویارک یونیورسٹی، راک فیلر سنٹر، ٹرینیٹی چرچ وغیرہ وغیرہ فلم کی طرح چل رہے تھے۔ شام ۷ بجے ہمارا یہ بحری سفر اختتام کو پہنچا۔

میں گرتے پڑتے براڈوے کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے آٹھ بجے ریڈیو سٹی میوزک ہال پہنچنا تھا۔ ایک میوزک گروپ جس کا نام ''راکٹس (Rockettes) ہے اور جو چھتیس ہوش ربا حسیناؤں پر مشتمل ہے، جن کا رقص وسرور اور موسیقی امریکی نوجوانوں کو پاگل کئے ہوئے تھی۔ میں لائن میں کھڑا ہال کے باہر کے مجمع کو دیکھ رہا تھا۔ ٹکٹ صرف دس ڈالر کا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا تھیٹر ہے۔ اس میں ۶۲۰۰ آرام دہ نشستیں ہیں۔ اس ایئر کنڈیشنڈ ہال میں ساری دنیا کے سیاح جمع تھے۔ اس نرالے اور انوکھے گروپ نے جو وعدہ کیا تھا ویسا ہی پروگرام پیش کیا۔ دن بھر کی تھکن کے بعد ان پریوں کے جھرمٹ میں واہ واہ کرنے سے زیادہ مجھے نیند کے جھونکے آرہے تھے۔ اس رنگ ورامش کے ساتھ کچھ نیند کا مزہ لیتا ہوا رات دس بجے میں باہر نکلا۔ سڑک پر زندگی رواں تھی۔ نیویارک اپنی تمام تر رونقوں سمیت بہت اچھا، بہت گنجان، بہت گندہ، اور بہت سستا شہر لگا مگر یہ آپ پر منحصر ہے کہ اسے اپنی جیب کے مطابق کھوج نکالیں۔



جگت باسی ''این/ وائی''

مہاجرین جو امریکہ کو آباد کرنے دور دراز ملکوں سے آئے، ان میں سے بیشتر نے نیویارک کو اپنا مسکن بنایا۔ ان دنوں یورپ سے بحری درآمد و برآمد کی وجہ سے نیویارک بندرگاہ کافی مصروف تھا (جو کہ آج بھی ہے) اور کام کی آسانی اور مانگ تھی۔ (جواب آسان نہیں) بھانت بھانت کے لوگ اپنی اپنی بولی، رسم ورواج، تہذیب وثقافت لئے نیویارک کی آبادی بڑھانے لگے۔ ان میں مزدور، کسان، بڑھئی، معمار، موچی، خانساماں، ساتھ ہی ادیب، شاعر اور صحافی، موسیقار، اداکار اور مصور اپنے فن اور قلم کو سنبھالے اس دھرتی کو سنوارنے اور سجانے لگے لہٰذا دنیا کے شہروں میں ایک وسیع المشرب اور صلح کل جگت باسی شہر کا اضافہ ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ کولمبس کی دریافت سے بہت عرصہ پہلے چینیوں نے امریکہ کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ اس سلسلے میں ریسرچ جاری ہے۔ چینیوں نے یہ دریافت کی ہو یا نہ کی ہو مگر اتنا ضرور ہے کہ اہل چین جہاں گئے نہ صرف اپنی بود و باش اپنے ساتھ لے گئے بلکہ جس شہر یا علاقے کو اپنایا اسے خالص اپنے رنگ میں رنگ لیا اور اپنی محنت اور اکتا سے وہاں چائنا ٹاؤن ضرور بنایا۔ نیویارک میں بھی مختلف قومیت کے باشندوں نے اپنے لئے علاقے چن کر وہاں اپنی برادری کو فروغ دیا۔ ان سب میں سب سے مشہور اور قابل دید چائنا ٹاؤن ہے۔

سیاحوں کے لئے خصوصاً یورپین کیلئے چائنا ٹاؤن اور اس کے ریستوران ایک خاص کشش رکھتے ہیں۔ میں بھی کشاں کشاں منہاٹن کے جنوب میں آباد چائنا ٹاؤن چلا۔ سب وے ٹرین سے میں کنال اسٹریٹ پر اترا اور چینی پدیاترا پر چل پڑا۔ دور سے ہی لال پیلی جھنڈیاں لہراتی نظر آئیں اور چینی زبان میں نیوئن سائنس چمک رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ کوئی دس ہزار اہل چین نے نیویارک کے اس علاقے کو سرزمین چین بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہاں زیادہ تر چینی زبان استعمال میں ہے۔ انگلش صرف ضرورتاً بولی جاتی ہے۔ میرے سامنے بینک آف ہانگ کانگ تھا جس کی عمارت ایک بڑے سے لال اور ہرے پگوڈے کی طرح تھی۔ گیٹ پر دو سنگ مرمر کے ببر شیر آنے والوں کیلئے دھاڑ رہے تھے۔

مین چائنا ٹاؤن شروع ہونے سے پیشتر سونے چاندنی کے زیورات کی ایک بہت بڑی بڑی منڈی ہے۔ یہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگ ہیرے کی دلالی بھی کرتے ہیں۔ سنا ہیرا یہاں سستا ہے مگر مجھے اس سے کیا۔ دکانوں کے ساتھ ہی سیکڑوں لوگ فٹ پاتھ سبزی، مچھلی، پھل، پھول سے لے کر کھلونے، کپڑے، گھڑیاں، ریڈیو اور کیا کچھ نہیں بیچ رہے تھے۔ ماحول سو فیصد مشرقی۔ تھوڑی دیر کے لئے میں بھول گیا کہ میں نیویارک میں ہوں۔ اس علاقے میں اشتہار بھی چینی زبان میں تھے اور دکانوں کے بورڈ بھی چینی اور انگلش میں تھے۔ ایک سائز اور رنگ کے مختلف عمروں والے چینی سپوت زور زور سے چینی زبان میں بات اور کام دونوں کر رہے تھے۔ چینی بڑے محنتی لوگ ہوتے ہیں۔ ہر کام پورا کنبہ عبادت کی سی عقیدت کے ساتھ کرتا ہے۔ یہاں نہ صرف مکان چینی طرز اور رنگ کے تھے بلکہ پبلک فون بھی چھوٹے پگوڈے کی شکل کے بنے ہوئے تھے۔

میں کافی دیر تک چائنا ٹاؤن کی سیر کرتا رہا۔ اس دوران مجھے کلکتے کا چائنا ٹاؤن یا چینا پاڑہ اور چینی دوستوں کی بہت یاد آئی۔ جیسے جیسے میں چائنا ٹاؤن کے اندروں میں بڑھ رہا تھا۔ گلیاں تنگ اور آبادی گنجان ہوتی جا رہی تھی۔ چھوٹے اسٹالوں پر چینی، اخبار، رسالے، فلمی پرچے فروخت ہو رہے تھے۔ چائنا ٹاؤن سے کئی اخبارات بھی نکلتے ہیں جن میں ''نیو چائنا'' اور ''ایسٹ ویسٹ'' مشہور ہیں۔ یہاں کا سب سے مشہور اور خاص دن سالانہ چائنیز نیو ایئر پریڈ ہے جسے دیکھنے دور دور سے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ اس خوش رنگ جلوس میں ڈراگون ڈانس دیکھنے سے تعلق رکھتا

ہے۔اس دن رنگ رلیوں کے ساتھ کافی پٹاخے اور غبارے چھوڑے جاتے ہیں۔اس علاقے میں اگر کسی کاروبار کو صحیح فروغ ملا ہے تو وہ چائینیز ریستوران ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ ہر دوسری دکان میں ایک ریستوران آباد تھا۔میں نے یہاں ایک پیکنگ ڈک Peking Duck نامی ریستوران کی بڑی تعریف سن رکھی تھی۔اسے ڈھونڈتا ہوا میں چینی مندر چھٹام سکوائر تک نکل آیا۔گوتم بدھ کا ایک قد آدم مجسمہ گیان دھیان میں مست نظر آیا۔آخر کسی وانگ چانگ اسٹریٹ پر پیکنگ ڈک کا بورڈ نظر آیا۔دومنزلہ عمارت والا یہ ریستوران کم خرچ بالانشیں تھا۔میں نے بیٹھتے ہی ایک خوش شکل چینی بچی سے جو Hostess تھی پانی اور Toilet کا ایک ساتھ پوچھا۔وہ میرے عجیب سوال پر بوکھلائی اور جلدی سے کہا نیچے ہے۔میں شکریہ کہتا ہوا نیچے آیا تو اپنے آپ کو دوبارہ سڑک پر پایا۔بڑی کوفت ہوئی۔دوبارہ اوپر گیا تو محترمہ کے ہونٹوں پر ایک شریر مسکراہٹ کے ساتھ کچھ خفت بھی تھی۔معافی مانگتے ہوئے ہال کے آخر میں نیچے جانے والی سیڑھی کی طرف اشارہ کیا۔واپس آ کر میں نے اپنی میزبان کا دوبارہ شکریہ ادا کیا اور میز پر رکھے مینو کو دیکھنے لگا۔امریکنیوں کو ہشیار کرنے کی غرض سے مرچ والی تیز ڈشوں کو لال روشنائی سے چھاپا گیا تھا۔میں نے سوچ سمجھ کر Shrimp with Garlic Sauce اور Veg. Fried Rice کا آرڈر دیا۔چائے کی کیتلی میری غیر حاضری میں کوئی رکھ گیا تھا۔پہلی پیالی ختم ہو رہی تھی کہ کھانا آ گیا۔کافی دنوں بعد تیز مرچوں والا مزیدار کھانا کھایا تھا۔بس مزاہ آ گیا۔کھانے کے بعد میں دوسری پیالی پی رہا تھا کہ ویٹر ایک بہت چھوٹے سے جام میں ایک عمدہ مشروب لے آیا۔نام میں نے تکلفاً نہیں پوچھا کیونکہ وہ فری تھا۔بل (جسے امریکہ میں چیک کہتے ہیں) کے ساتھ تکون نما بسکٹ بھی دیا گیا جس کے اندر قسمت کی پرچی رکھی ہوتی ہے۔اسے توڑا تو اندر ایک سفید جھوٹ والی پرچی میرا منہ چڑا رہی تھی، لکھا تھا ''تمہاری قسمت میں سفر نہیں ہے'' حالانکہ میں مسلسل سفر میں تھا، میرا بل کوئی اٹھارہ ڈالر کا تھا۔بیس کا نوٹ (جسے یہاں بل کہتے ہیں) دے کر اٹھ رہا تھا کہ سامنے والی میز پر ایک ویٹر نے ٹرے لا کر رکھی۔اس پر دلکش سبزیوں کے بیچ ایک بھنی ہوئی بطخ ایسے بیٹھی تھی کہ ابھی انڈا دے ہی دے گی۔اس خوبصورت ڈش میں گردن سمیت بطخ عجیب سی لگ رہی تھی۔بس میں بائی بائی کہتا وہاں سے اٹھ آیا۔نیچے وہی بھاگ دوڑ اور خرید و فروخت جاری تھی۔یہاں کی دکانوں میں ہرے جیڈ Gade اور ہاتھی دانت کے سامان اور زیور بھی بہت دیکھے۔ایک سٹور پر شنگھائی کی اصل سلک دیکھی جو دو سو روپے گز تھی۔سوچا جلدی کیا ہے اگلی بار کچھ خرید ہی لیں گے۔

چائنا ٹاؤن سے کچھ ہی فاصلے پر ''لٹل اٹلی'' آباد ہے۔یہاں اطالوی نژاد اپنی دنیا میں مگن ہیں۔یہاں بہت سارے اطالوی ریستوران اور پیزے کی دکان ہیں۔اپنے سفر میں دیسی کھانے کے علاوہ اگر کھانے کو میں نے خوب سیر ہو کر کھایا تو وہ پیزا'' (Pizza) تھا۔یہ ایک ڈالر کی سلائس مل جاتی ہے اور غذائیت اور مزے کے ساتھ اس سے پیٹ بھر جاتا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں سیکڑوں اطالوی نیویارک آئے اور میلبری اسٹریٹ میں آباد ہونا شروع ہوئے۔رفتہ رفتہ ایک بستی ظہور میں آئی اور اس کا نام ''لٹل اٹلی'' ہو گیا۔ہر سال ستمبر کے مہینہ میں '' سان جینارو'' کا تہوار یہاں بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔اس علاقے میں پگا لیا ریستوران کی اسپاگھیٹی اور ناپولی کیفے کی کپوچینو (Cappuccino) بہت مشہور ہے۔کچھ ہی فاصلے پر آلیو نام کی ایک اطالوی بساطی کی دکان پر ۱۸۹۲ء کا بورڈ لگا ہوا ہے جہاں Formaggi اور Mozzarella پنیر کے لئے لائن لگتی ہے۔ساتھ ہی اس دکان کی اسپاگھیٹی، نوڈل وغیرہ بھی مشہور ہے۔

سیاہ فام افریقی غلاموں کو انگلش کالونی والے امریکہ کو سنوارنے، بنانے، پلوں کی تعمیر، زمین دوز ریل کی کھدائی، سرنگوں اور دیگر جسمانی مزدوری کے لئے لائے تھے۔ان کے ساتھ بڑا ظلم کیا گیا۔پھر ان کی اولادیں آزاد کی گئیں مگر آزادی اور برابری حاصل کرنے کے باوجود ان کے اندر احساس کمتری اب تک موجود ہے۔نیویارک میں ویسے تو ہر علاقے میں کالے پائے جاتے ہیں مگر ان کا خاص علاقہ برانکس ہے۔

یہودی نیویارک کی تجارتی اور ثقافتی زندگی میں ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہیں۔خصوصاً بینکنگ اور اسٹاک ایکسچینج پر ان کا قبضہ ہے۔یہ لوگ ہر جگہ موجود ہیں مگر کوئنز کے کچھ علاقوں اور منہاٹن کی فلک بوس عمارتوں میں رہتے ہیں۔ان کے علاقوں سے اندازہ نہیں ہوتا کہ یہودی یہاں رہتے

ہیں۔ ہاں ایک نمایاں نشان اس علاقے میں کوشر گوشت کی دکانیں ہیں۔ یہودی ذبیحہ کو کوشر کہتے ہیں اور ایسی دکانیں عام گوشت کی دکانوں سے مہنگی ہوتی ہیں مگر یہودی گوشت صرف کوشر کھاتے ہیں۔ گوشت تو معمولی چیز ہے کمبخت شراب بھی کوشر پیتے ہیں ؎

کون کہتا ہے کہ رندوں کو خدا یاد نہیں

سنا ہے کہ ہفتہ یا اتوار کو یہودی مرغی کی ٹانگ نہیں کھاتے ہیں۔ اس دن مرغی کی ٹانگوں کی سیل لگ جاتی ہے اور مجھ جیسوں کی عید۔ زمین دوز ریل میں اکثر میں نے یہودیوں کو دیکھا وال اسٹریٹ جرنل نامی اخبار میں الجھے ہوئے یہ لوگ زیادہ تر کالا اور کوٹ اور کالی ہیٹ میں سب سے الگ تھلگ کنپٹی سے دو لٹیں بالوں کی جھولتی ہوئی نئی نسل کے یہودی بھی دور سے پہچانے جاتے ہیں۔ سر پر ٹوپی یا ہیٹ کی جگہ ایک چھوٹا سا مخمل کا پیوند لگا ہوا نیویارک میں ان کے سینا گوگ اور جیوئش سنٹر بڑی شان و شوکت سے آباد ہیں۔

ان کے تہواروں میں Yom Kipur ایک ایسا تہوار ہے جس میں یہودی شاید روزہ رکھتے ہیں۔ ان دنوں پورے نیویارک کا کاروبار خصوصاً ریستوران بالکل ٹھپ ہو جاتا ہے اور اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نیویارک میں یہودیوں کی کتنی تعداد ہے۔ کاروبار اور تجارتی مرکزوں کے علاوہ بھی یہودی بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ عمدہ وکیل بھی بیشتر یہودی ہیں۔ فنون لطیفہ میں خاص کر موسیقی میں بھی ان کا خاصا دخل ہے۔ موسیقی سے یاد آیا کہ ایک امریکن دوست کے ساتھ کارنیگی ہال میں نیویارک فل ہارمونک آرکسٹرا کا شو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میرے امریکن دوست کی ملاقات اس آرکسٹرا کے ایک موسیقار Lakarman سے تھی اور اس نے ہمیں مدعو کیا تھا مگر وہاں پہنچ کر پتہ چلا بلکہ یاد آیا کہ نیویارک فل ہارمونک آرکسٹرا کا Conductor یعنی مائی باپ زوبن مہتا ہے۔ میں نے اس خبر کو بہ بانگ دہل اپنے امریکن دوست مارک کو سنایا کہ زوبن مہتا ہندستانی پارسی ہے اور یہ اور بات ہے کہ بمبئی والوں نے اس کی قدر میری طرح نہ کی اور اب وہ مغربی آرکسٹرا میں کھا کما رہا ہے۔ سنا پچھلے دنوں مہتا اپنے ٹروپ کے ساتھ مادر وطن کی گلیوں کی خاک چھاننے یا پھانکنے آیا تھا مگر اس کی وہ خاطر نہ ہوئی جو ہونی چاہئے۔

ہندستانیوں نے بھی لٹل انڈیا بنا رکھا ہے کوئینز کے کچھ علاقوں میں کافی تعداد میں ہندستانی آباد ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس شہر میں چالیس ہزار اردو بولنے والے پاکستانی اور ہندستانی موجود ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی پر اردو، ہندی کے پروگرام ویک اینڈ پر ہوتے ہیں۔ مشاعرے، شام غزل، اسٹیج شو، مس انڈیا۔ یو ایس اے کا مقابلہ اور جشن آزادی کی پیریڈ بڑی دھوم دھام سے نکالی جاتی ہے۔ کولمبیا یونیورسٹی میں اردو اور ہندی کی درس و تدریس کا سلسلہ بھی ہے۔ اردو کی پروفیسر فرانسس پریچٹ سے ظفر زیدی نے ملاقات کرائی جو غالب کو اس طرح ٹھونک بجا کر پڑھا رہی تھیں جیسے استاد اللہ رکھا اپنے شاگردوں کو طبلے کی تھاپ سکھا رہے ہوں۔



فورٹی سیکنڈ اسٹریٹ

یہ فورٹی سیکنڈ اسٹریٹ ہے پیارے
نیویارک کی ہیرا منڈی
مغرب کی تہذیب کا رنگین اشتہار
قہقہوں کی بارش
نیون سائن
چمکتی سنہری سڑکیں
گرم بوسوں اور ٹھنڈے گوشت کی بولی لگ رہی ہے
یہاں عریانیت قانونی ہے بھائی،
یہاں صبح ہوتی نہیں ہے......
پیپ شو میں رینگتی بلیو فلمیں
اور اس پر مچلتا
کالے گورے اور زرد چہروں کا اژدہام
اپنی خواہشیں خریدتی سیاحوں کی ٹولیاں
محوِ خرام ہیں!
اس بازارِ حسن کے بیچ
مسیح کے گورے داعی انجیل کے تبرکات بانٹتے
مائیک پر چیخ چیخ کر روزِ جزا کی یاد دلا رہے ہیں
ساتھ ہی بے ہنگم اور تیز موسیقی پر
جوان جسم تھرک رہے ہیں
اس سے پَرے
وائلن پر ایک پروفیشنل درویش
کوئی دلکش دھن سنانے کی کوشش کر رہا ہے،
لوکالوں کی ایک ٹولی
مسیح کو کالا ثابت کر رہی ہے

کتاب گھر کی پیشکش
http://www.kitaabghar.com
urdukutabkhanapk.blogspot.com

کمسن مگر مکروہ جوان چرس کے سگریٹ بیچتے
اور معصوم جسم اپنے گناہوں کو
نشے کے دھوئیں میں اڑا رہے ہیں
یہیں شائی لاک کے بھائی انسانی گوشت خریدنے
گھوم رہے ہیں
ایک کونے میں میز پر ایمان کی دکان سجائے
ایک کالا نومسلم نما
تسبیح، قرآن اور عطر کی قیمت بتا رہا ہے
یہاں ہر شئے بکاؤ ہے
جسم، خوشبو، ایمان اور صحیفے
سب سستے ہیں
یہ فورٹی سیکنڈ اسٹریٹ ہے پیارے!!

•••

کتاب گھر کی پیشکش
http://www.kitaabghar.com
urdukutabkhanapk.blogspot.com

وہائٹ ہاؤس کی کالی باتیں

آج میری آوارگی کا چالیسواں دن تھا۔ انجان شہروں میں بھٹکتے اور رات گئے تک ڈائری سیاہ کرتے پورے چالیس روز ہو گئے تھے۔ وقت اور شبانہ روز کے پر لگ گئے تھے اور دل تھا کہ کہیں سے اکتاتا ہی نہیں۔ ہاں تھکن یا اکتاہٹ سی ہوئی تو ہوائی جہاز سے۔ کاش میں اس بری شئے کے خالق رائٹ برادران سے مل پاتا۔ میں اونچی اڑان کا قائل ضرور ہوں مگر ایسی پرواز جس کی کوتاہی پر شریف مسافر کو ایک سیٹ پر پیٹی باندھ کر بٹھا دے۔ توبہ بھلی۔ آزادی نام کی چیز سرے سے غائب —— ہم تھری ٹائر ایکسپریس کے عادی ہیں۔ اس کی آزادی نے عادت بگاڑ دی ہے۔ سیٹ پر کھانا کھایا۔ بغل میں کلّی کی، چادر بچھا کر اور اخبار اوڑھ کر اپنی برتھ کے باہر تک پاؤں پسارے رات گئے تک جاگتے ہیں اور دن چڑھے تک سوتے ہیں۔ کیا مجال کہ کوئی آرام میں خلل ڈالے۔ ایک ہوائی جہاز ہے من چاہے گیت تو درکنار آپ زور سے بات بھی نہیں کر سکتے۔ اب یہ ساری قباحت جانتے ہوئے بھی ہوائی سفر نہ کریں تو کیا کریں۔ ہماری ایکسپریس امریکہ جاتی بھی تو نہیں۔

نیویارک سے واشنگٹن ڈی۔سی جانے کے لئے میں نے چھ جہاز چھوڑ کر لگژری بس Grey Hound کا انتخاب کیا جو چار گھنٹے میں ڈی سی پہنچتی تھی۔ آرام دہ فوم کی سیٹیں، ایئر کنڈیشنڈ، منتخب فلموں کی .V.C.R پر نمائش، سگریٹ پینے کے لئے اجازت مانگئے، بس میں اچھل پھاند نام کو نہیں۔ بس کا کرایہ صرف تیس ڈالر۔ میں خوشی خوشی چار گھنٹے گم Gum چباتا ہوا رات کے تین بجے واشنگٹن پہنچا۔ بس اسٹیشن سے باہر ٹیکسی مل گئی اور چند منٹوں میں ہم جارج واشنگٹن یونیورسٹی کیمپس میں داخل ہو رہے تھے۔ یہاں میرے ایک قریبی ساتھی کلکتے کے جناب جوہر مقیم تھے۔ دروازے پر کال بیل کی چیخ پر انہوں نے نہایت شستہ انگریزی میں پوچھا "کون ہے بے؟" میری آواز سن کر موصوف بہت خوش ہوئے۔ حیرت سے پوچھا اس وقت کس طیارے سے آئے ہو۔ میں نے بتایا کہ بس سے آ رہا ہوں۔ پتہ چلا کہ میں نے صرف دس ڈالر زائد خرچ کئے ہیں اور کوئی تین گھنٹے بھی برباد کئے ہیں کیونکہ جہاز امریکہ میں بس سے ارزاں ہے اور نیویارک۔ واشنگٹن کا صرف بیس ڈالر کرایہ ہے۔ خیر اب تو میں تجربہ کر چکا تھا۔ آگے احتیاط کا عہد کیا۔ اِدھر اُدھر کی بات ہوئی۔ میں نے ہندوستانی تحفے مثلاً چائے کی پتی، اگربتی، امرت انجن وغیرہ ان کے سامنے رکھ دیئے۔ جوہر بہت خوش ہوئے۔ شاید اسی خوشی میں انہوں نے اپنے والدین، بھائی اور دوستوں کی خیریت دریافت نہیں کی۔ اب تک کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے ساتھی نے اپنی ثقافت اور قدروں کو امریکی چمک دمک اور ایمیٹیشن کے عوض گم کر دیا تھا۔ یعنی امریکہ کی ہوا لگ گئی تھی اور فضا ان کے موافق تھی۔ والدین کے ذکر پر جناب رنجیدہ تو ہوئے مگر وہ بھی کیا کریں۔ امریکہ میں خط لکھنے کی کسے فرصت؟ سفر کی تھکان تھی۔ بات کرتے کرتے ہم سو گئے۔ کوئی دس بجے آنکھ کھلی۔ جوہر نے خود ناشتہ تیار کیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم تیار ہو گئے۔ اتوار کا دن تھا۔ آرام سے ناشتہ کیا گیا۔ کوئی گیارہ بجے ہم جارج واشنگٹن کے شہر کو دیکھنے نکلے۔ جوہر مہمان نواز تو کلکتے ہی سے تھے اس لئے میری خاطر داری میں کمی نہیں ہوئی مگر ان کے پاس اتوار کو بھی وقت نہ تھا۔ مجبوراً مجھے نقشہ کی مدد سے تنہا نکلنا پڑا۔ موسم خوشگوار تھا۔ راستے صاف اور کشادہ تھے۔ میں سب سے پہلے وہائٹ ہاؤس دیکھنا چاہتا تھا مگر معلوم ہوا کہ اتوار کو بند رہتا ہے اور عام دنوں میں دس سے بارہ بجے تک سیاحوں کے لئے کھلا رہتا ہے۔

خوش قسمتی سے میں جارج واشنگٹن یونیورسٹی کیمپس میں ہی ٹھہرا تھا اس لئے اس وسیع و عریض دانش گاہ کے مختلف شعبوں کو دیکھنے اور چند

دیگر ساتھیوں سے ملنے میں سارا دن گزر گیا۔ چھٹی کے باوجود بہت سے ڈیپارٹمنٹ کھلے ہوئے تھے اور خاص طور پر ریسرچ اسکالر اپنے کام میں مشغول تھے۔ شام کو میں اپنے کمرے میں واپس آیا تو جوہر کو منتظر پایا۔ ساتھ ہی ایک اور صاحب بیٹھے تھے۔ پتہ چلا کہ جناب نظام الدین بھی علیگیرین ہیں اور یہاں کمپیوٹر سائنس کے کچھ کورس کر رہے ہیں۔ بڑے تپاک اور خلوص سے ملے۔ پہلی ملاقات میں اندازہ ہو گیا اس شخص نے اپنی انفرادیت کو بچا رکھا ہے۔ بھائی نظام بہت جلدی گھل مل گئے۔ جوہر کے اصرار پر ہم تینوں ایک قریبی ریستوران میں کھانا کھانے گئے۔ یونانی ڈش Gyro کا آرڈر دیا گیا اور ہم لوگ باتوں میں مصروف ہو گئے۔ چالیس منٹ بعد ایک بڑی بن روٹی پر بھیڑ کے گوشت کے قتلے، سوختہ تلے ہوئے سجے تھے۔ ساتھ ہی مختلف اقسام کی سلاد تھی۔

کھانا مزے کا تھا۔ ڈٹ کر کھایا گیا۔ ساتھ ہی گرم کافی نے مست کر دیا گو نظام صاحب بھی مصروف تھے مگر انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ میرا ساتھ دیں گے۔ انہیں رخصت کر کے ہم لوگ نائٹ شو فلم "IF" دیکھنے چلے گئے۔ کافی دنوں کے بعد ایک اچھی فلم دیکھی۔ واپس آ کر خط لکھنے بیٹھ گیا اور جوہر سو گئے کیونکہ انہیں صبح سات بجے ہی کام پر جانا تھا۔ خود کو امریکی ثابت کرنے کے چکّر میں بے چارے روزانہ دو ڈھائی گھنٹہ اوور ٹائم کام کر رہے ہیں۔

دوسرے دن صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں کمرے میں تنہا تھا۔ میرے میزبان جا چکے تھے۔ میں نے جلدی جلدی خود کو تیار کیا۔ جو کچھ دستیاب تھا ناشتہ کیا اور باہر نکل پڑا۔ آج رونق کچھ زیادہ تھی۔ لڑکیاں، لڑکے راستے پر اور اپنے کلاسوں میں نظر آ رہے تھے۔ میں یونیورسٹی روڈ سے ہوتا ہوا Street 21 پر پہنچا۔ نقشہ ہاتھ میں تھا۔ کچھ اس میں دیکھتے، کچھ پوچھتے نیشنل اکیڈمی آف سائنس چھوڑتا ہوا ایک چوراہے پر پہنچا۔ بائیں ہاتھ پر پین امریکن کی بلڈنگ تھی۔ اب جو راستہ ملا وہ پنسلوانیا ایونیو تھا اور کچھ ہی فاصلے پر وہائٹ ہاؤس نظر آ رہا تھا۔ میری طرح اور بھی بہت سے سیاح اسی طرف خراماں خراماں چلے جا رہے تھے۔ اس شہر میں سکون تھا اور مشینی زندگی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہائٹ ہاؤس کے قریب ایلز بیکٹو ایونیو پر ایک سنگِ میل نصب تھا جس پر زیرو مائیل اسٹون Zero Mile Stone کندہ تھا۔ یعنی امریکہ کا ہر راستہ یہیں سے شروع ہو کر مختلف منزلوں کو جاتا ہے۔ لوگوں کی بھیڑ ایک لمبی قطار کی شکل میں کھسک رہی تھی۔ سیکیوریٹی کے اسمارٹ گارڈ اس لمبی قطار کو سنبھالے ہوئے تھے۔ میں بھی لائن میں لگ گیا۔ ایسا لگا کہ دہلی کے پاکستانی سفارت خانے میں کراچی کا ویزا حاصل کرنے والوں کی بھیڑ بہت ہی صبر و تحمل سے اپنے نمبر آنے کا انتظار کر رہی ہے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ کھسکنے کے بعد اس عالمی مرکزِ نگاہ عمارت میں داخل ہوا۔ سیکیوریٹی والوں نے تلاشی لی اور مسکراتے ہوئے اندر جانے کو کہا۔ میں اوروں کے ساتھ مشرقی دروازے سے East Wing کی کشادہ لابی میں داخل ہوا۔ اس مرصع ہال میں قد آدم تصویریں گزرے ہوئے صدروں اور ان کی بیگمات کی لگی ہوئی تھیں۔ ان میں جولیا گارڈنر ۱۸۴۸ء کی تصویر بھی تھی۔ اس کے ساتھ والے ہال میں جیکولین کینڈی اوناسس کی قد آدم تصویر آنے والوں کا استقبال کر رہی ہے۔ ہال سے ہوتے ہوئے میں ایک چھوٹے مگر خوبصورت کتب خانے میں پہنچا جہاں اٹھارہویں صدی کے آغاز کا ماحول تھا۔ فرنیچر اور لکڑی کی الماریوں میں دلکش جلدوں میں کتابیں سجی تھیں۔ اس کے بعد کا کمرہ چائنا روم تھا جس میں چینی مٹی کے نادر ظروف اور سجاوٹ کے دیگر سامان لگے تھے۔ سفارتی استقبالیہ کا کمرہ صدر کے مہمانوں کے لئے تھا۔ ساتھ کا کمرہ میپ روم Map Room تھا جہاں دوسری جنگِ عظیم میں جنگی نقشوں کا مطالعہ ہوتا تھا۔ ایک بارہ دری بھی تھی جہاں سرخ رنگ کی دبیز قالین بچھی تھی۔ اس قالین پر سے ہوتے ہوئے ہم ایسٹ روم میں پہنچے جہاں صدر کے خاندانی پروگرام اور رقص و سرود کی محفل جمتی تھی۔ اس ہال نما کمرے میں پہلے صدر جارج واشنگٹن کی قد آدم تصویر کھڑی تھی۔ گو جارج واشنگٹن کے انتخاب پر امریکی صدر کی رہائش کے لئے وہائٹ ہاؤس کی تعمیر ہوئی تھی مگر وہ خود اس میں نہیں رہے۔ میں گروپ کی شکل میں نیچے کی تمام چیزیں جلدی جلدی دیکھ چکا تھا تو پہلی منزل پر پہنچا۔ وہائٹ ہاؤس گو صدر کی رہائش اور آفس دونوں ہے لیکن پبلک کیلئے ایک عجائب خانہ سے

کم نہیں۔ یہاں پہلا کمرہ گرین روم تھا جہاں کی ہر چیز سبز تھی۔ پردہ، قالین، ساز و سامان اور دیوار کا روغن بھی۔ اس کے بعد بلو روم، پھر ریڈ روم۔ اس سے متصل اسٹیٹ ڈائننگ روم جہاں ایک وقت کے طعام کے لئے کوئی ایک سو گیارہ مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ اس کے پیچھے فیملی ڈائننگ روم پھر کوئنز بیڈ روم اور لنکن بیڈ روم۔

اب اس عمارت کا سب سے خاص کمرہ ''دی ٹریٹی روم'' The Treaty Room نظر کے سامنے تھا۔ اسے پہلے کیبنٹ روم Cabinet Room بھی کہتے تھے۔ یہی وہ کمرہ ہے جہاں سے دنیا کی تقدیر بگاڑنے اور سنوارنے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ صدر اپنے خاص مشیروں کے ساتھ یہاں خاص اور خفیہ دستاویز پر دستخط کرتا ہے۔ ہر سیاح کو کوئی بارہ منٹ ملتے ہیں پورے وہائٹ ہاؤس کی سیاحت کے لئے۔ ابھی کچھ وقت باقی تھا کہ گھنٹی بجنے لگی اور ہم باہر خوبصورت ہرے بھرے لان میں آ گئے۔ اندر ایک گمبھیر خاموشی تھی مگر باہر نکل کر لوگ کھل کر باتیں کر رہے تھے۔ تقریباً پوری دنیا کے سیاح موجود تھے۔ باہر طرح طرح کا احتجاج بھی ہو رہا تھا مگر ساتھ ہی بڑے مزے مزے کی باتیں لوگوں سے سنیں۔ خود وہاں کے ایک بوڑھے مالی نے بتایا کہ وہائٹ ہاؤس آسیب زدہ ہے۔ اس نے خود آنجہانی سربراہوں کی روحوں کو یہاں ٹہلتے دیکھا ہے۔

وہائٹ ہاؤس کی تعمیر ۱۷۹۲ء میں شروع ہوئی اور ۱۸۰۰ء میں صدر حضرات نے یہاں رہنا شروع کیا۔ ۱۹۰ سال کے عرصہ میں جو بھی میزبان اور مہمان یہاں رہے ان کی روحیں آج بھی یہاں حاضری دیتی ہیں۔ جارج واشنگٹن (۱۷۹۷ء-۱۷۸۹ء) سے لیکر اب تک چالیس صدور امریکہ کے لئے چنے جا چکے ہیں مگر تاریخ کے مطابق جس صدر کے منتخب ہونے کے سال کے آخر میں صفر آتا ہے وہ قتل کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح نئے صدر ریگن جنہوں نے ۱۹۸۰ء میں انتخاب جیتا تو ان کی زندگی کو بھی ہر وقت خطرہ لاحق رہتا ہے۔ پچھلے دنوں ایک ایسا ہی واقعہ ہو چکا ہے۔ خوش قسمتی سے صدر ریگن بچ گئے۔ اب آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

●●●

http://www.kitaabghar.com
urdukutabkhanapk.blogspot.com

مشاعرے کی واہ سے شیزان کی آہ تک

واشنگٹن کی بردباری اور پُروقار امیج نے مجھے بہت متاثر کیا۔لوگ سنجیدہ اور متین، چیری بلاسمز کی طرح دھیرے دھیرے مسکراتی دوشیزائیں، کوپن ہیگن کی طرح دھیمے لہجے میں بات کرنے والے لوگ، نیویارک کی طرح چیخنے اور بھاگ دوڑ والے نہیں نہ ہی نیویارک کی طرح شوخ رنگ اور بھڑکیلے لباس زیب تن کرنے والے۔ان کے لباس سے ان کی ذہانت اور مزاج کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

اس امن پسند، کشادہ اور روایتی شہر میں کبھی جھگڑا فساد نہیں ہوتا نہ ہی دہلی کی طرح کئی بار اسے لوٹا گیا نہ ہی دہلی والوں کی طرح اس کی روزانہ زندگی پر کوئی سیاست اثر انداز ہوتی ہے مگر پھر بھی یہ جاسوسوں کا شہر کہلاتا ہے۔ یہاں جنگ نہیں ہوتی مگر اس شہر کے اشارے پر دنیا کے کسی بھی حصے میں جنگ چھڑ جاتی ہے۔

میں نہ یہاں کے بیوروکریٹ حضرات سے پریشان، نہ سیاست دانوں سے ہراساں نہ ہی جاسوسوں سے خوفزدہ تھا—بیزار تھا تو اپنے دیسی دوستوں کی دعوتوں اور پروگراموں سے۔مشکل یہ تھی کہ جب بھی میں کہیں گھومنے کا پروگرام بناتا تو کوئی نہ کوئی دوست کسی دعوت، کوئی مشاعرہ یا نشست یا پھر کسی استقبالیے کی خبر لے آتا اور میں مجبور ہوجاتا کہ قسمت والوں کو دیارِ غیر میں کمپنی یا دوست احباب ملتے ہیں۔

یوں تو اردو زبان وادب کو امریکہ میں عام طور پر مقبولیت حاصل ہے مگر واشنگٹن میں اردو کیلئے کچھ زیادہ ہی جوش وخروش دیکھا۔نشستوں، مشاعروں اور کلچرل پروگراموں کے علاوہ ریڈیو اور ٹی وی پر بھی مخصوص اردو پروگرام ہوتے ہیں۔علیگیرین ایسوسی ایشن کے کچھ ساتھی مجھے ایسے پروگراموں میں پیش پیش رکھ رہے تھے۔ہندوستانی فلمیں بھی بڑے شوق سے دیکھی جاتی ہیں۔میرے قیام کے دوران چند فلمیں یہاں دکھائی جا رہی تھیں جن میں ''پھول کھلے ہیں گلشن گلشن''، ''آدھا دن آدھی رات''، ''آپ تو ایسے نہ تھے'' وغیرہ میں لوگ بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔ایک کلچرل پروگرام دیکھنے کا اتفاق ہوا جو 'عالمگیر شو' کے نام سے تھا۔ٹکٹ صرف پندرہ ڈالر کا تھا۔عالمگیر پاکستان کا ایک ابھرتا ہوا گلوکار ہے ساتھ ہی مہناز کے گانے بھی تھے اور ''ننھا'' نامی کامیڈین کے مزاحیہ خاکے تھے۔اس پروگرام کی دعوت ایک پاکستانی ساتھی نے دی تھی اس لئے یہ میرا اخلاقی فرض تھا کہ اس کی تعریف کردی جائے۔ویسے ''فرینڈس آف پاکستان'' نامی کلب نے بھی استقبالیہ دیا تھا۔چند ساتھی جو ہندوستانی، پھر پاکستانی اور اب امریکن بن گئے ہیں کافی عرصے بعد ملے۔اس ڈرامائی ملن سے میں بہت خوش ہوا۔انہی دنوں پتہ نہیں دانستہ یا نادانستہ طور پر فلم اسٹار امیتابھ بچن نے بھی کلیان جی، آنند جی مع عزیز نازاں، امیت کمار، کنچن اور دیون ورما کے ساتھ واشنگٹن میں ہلچل مچا رکھی تھی۔لوگوں کا جنون بیان سے باہر ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ اسی دن ایک بہت ہی اچھا مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا۔اردو سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے اس مشاعرے میں جگن ناتھ آزاد اور کلیم عاجز اور دیگر امریکی (مقامی) شعراء تھے۔میں بھی مدعو تھا مگر اسی شام ایک اور پارٹی میں بھی شرکت کرنا تھی۔وہاں سے کسی طرح فارغ ہوکر میں گرتا پڑتا ولسن تھیٹر پہنچا۔پتہ چلا کہ مشاعرہ کامیابی کے ساتھ آخری منزل پر ہے۔میں سمجھ رہا تھا کہ رات بارہ بجیں گے مگر امریکہ میں وقت بہت قیمتی ہے۔مشاعرہ صرف دو گھنٹے کا تھا۔ہندستان تو ہے نہیں کہ ساری رات مشاعرہ چلتا ہے۔خیر بڑی خفت کے ساتھ ہال میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ میرا نام پکار کر انتظامیہ مایوس ہوچکی تھی، حالانکہ مایوس انہیں میری موجودگی سے ہونا چاہئے تھا) کچھ نے یہاں تک کہہ دیا کہ ارے وہ پکا نیشنلسٹ ہے۔امیتابھ کے ساتھ تال پر تال ملا رہا ہوگا اور کندھے اچکا رہا ہوگا۔

حضرت کلیم عاجز مائک سنبھالے مجھے اسٹیج پر آتے دیکھ رہے تھے اور شعر پڑھ رہے تھے:

بات چاہے بے سلیقہ ہو کلیم
بات کرنے کا سلیقہ چاہئے

جب میں ان کے بالکل قریب پہنچا تو انہوں نے پہچان لیا اور مسکراتے ہوئے بیٹھنے کو کہا۔ ان سے میری ملاقات کلکتہ کے ایک بہت پر تکلف دعوت میں ہوئی تھی۔ دعوتوں کی ملاقاتیں اکثر یاد رہ جاتی ہیں اس لئے میں بھی شاید انہیں یاد رہ گیا تھا۔ خیر کلیم صاحب کا ایک شعر مجھے بہت پسند آیا اور سامعین نے بھی بہت پسند کیا۔

حقیقتوں کا جلال دیں گے، صداقتوں کا کمال دیں گے
تجھے بھی ہم اے غمِ زمانہ غزل کے سانچے میں ڈھال دیں گے

کلیم صاحب کے بعد اناؤنسر صاحبہ نے مجھے سامعین کی عدالت میں کھڑا کر دیا۔ میں کلیم عاجز صاحب سے معذرت طلب کر لی کیوں کہ اصولاً مجھے ان سے پہلے پڑھنا تھا۔ بہر حال چند اشعار میں نے سنائے اور میرا ایک شعر سراہا گیا:

یا سفر میرا مختصر کردے
یا مجھے ہجرتوں کا یارا دے

جگن ناتھ آزاد سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اسٹیج پر مجھ سے مل کر خوشی اور شعر کی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ کیا پتہ شعر پسند آیا بھی تھا یا نہیں، یا وہ واشنگٹن کے اسٹیج کی تعریف کر رہے تھے۔ انہیں میں نے پہلی مرتبہ سنا تھا۔ ان کا یہ شعر بھی خوب پسند کیا گیا:

جب حریفوں کی زباں تھی شعلہ گفتاری میں غرق
میں تغزل کی زباں میں گفتگو کرتا رہا

مجھے افسوس اس کا رہے گا کہ میں دیگر امریکی اردو شاعروں کو نہ سن سکا۔ علیگ ساتھیوں خاص کر بھائی نظام کے اصرار پر میں اس مشاعرے میں شریک ہو گیا تھا۔ ویسے یہ لکھتے ہوئے مجھے کوئی جھجک نہیں کہ میں کمرشیل شاعر بلکہ کسی صورت کا شاعر نہیں۔ ہاں پروفیشنل ڈرامیٹسٹ ضرور ہوں اور آواز بیچنے اور کبھی کبھی خریدنے کا اکثر دھندا کرتا رہتا ہوں۔ اس مشاعرے کے بعد کئی نشستیں مختلف صاحبانِ ذوق کے یہاں رکھی گئیں جو بہت کامیاب رہیں۔

پروگراموں کے بعد دعوتوں کا ایک طویل سلسلہ چل پڑا۔ جوہر صاحب کے وسیلے سے اکثر دعوتیں ان کے دوستوں کے یہاں تھیں۔ ایک دعوت کے لئے کافی دور الکزنڈریا زمین دوز ریل سے جانا پڑا۔ جناب رومین پائیں جو پہلے کلکتہ ریڈیو پھر ٹی وی پر نیوز ریڈر تھے۔ ان دنوں وائس آف امریکہ (VOA) میں بنگلہ کے نیوز ریڈر اور مترجم ہیں۔ ان کی بیگم اور بچیاں بنگلہ میں گفتگو کر کے بہت خوش ہوئیں۔ مجھے بنگالیوں کی ایک ادا بہت پسند ہے کہ موشائے اپنے کلچر کو نہیں چھوڑتے اور جہاں بھی ہوں مچھلی اپنے طرز کی تیار کرتے ہیں۔ کھانا بالکل بنگلہ طرز کا تھا۔ کافی عرصے بعد کھایا تھا اسلئے بہت اچھا لگا۔ کانٹا چھچوں کی جگہ ہاتھ سے کھانا کھا کر اور مچھلی کی بے پناہ تعریف کر کے اٹھتے اٹھتے میں بھی ان لوگوں کو متاثر کر گیا اور پوری فیملی نے مشورہ دیا کہ میں آوارگی چھوڑ کر وائس آف امریکہ، ریڈیو سے منسلک ہونے کے لئے سنجیدگی سے سوچوں۔ میں وعدہ کر کے رخصت ہوا اور راستہ بھر ٹیگور کے الفاظ: What I seek, I get not— What I got, I seek not پر سوچتا رہا۔

دوسرے دن صبح ہی میں اپنی قیام سے تنہا نکل پڑا۔ قریب ہی فوگی باٹم (Foggy Bottom) میٹرو اسٹیشن سے ٹرین پکڑی اور آدھ گھنٹہ کے بعد روزالن پہنچا۔ ایک ساتھی نے وقت دے رکھا تھا۔ میں روزالن اسٹیشن سے باہر آ رہا تھا کہ سیڑھی پر ہی نظام بھائی سے ملاقات ہو گئی۔ مجبوراً مجھے طے شدہ پروگرام ملتوی کر کے ان کا ساتھ دینا پڑا۔ ان کا خلوص مجھے بے بس کر دیتا تھا۔ نظام صاحب شاپنگ کیلئے جا رہے تھے۔ میں بھی ساتھ

ہولیا۔ ایک بڑے ڈپارٹمنٹل اسٹور سے کچھ الٹی سیدھی شاپنگ ہوئی ۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ Bureau of Indian affairs بھی Constitution Ave. پر واقع ہے۔ وہاں میں نے مسٹر سنگھ سے ملاقات کی اور کام پورا کر کے نکلا تو نظام صاحب موڈ میں تھے۔ کہا چلئے آج کسی ہندستانی ہوٹل میں کھانا کھایا جائے۔ مجھے جیسے کسی نے کرنٹ لگا دیا۔ نظروں کے سامنے پیرس کا ہوٹل ''فخر ہندستان'' گھوم گیا۔ میں نے فوراً منع کیا اور انہیں سارا قصہ سنایا۔ وہ ہنسنے لگے اور کہا بھئی یہ پیرس نہیں امریکہ ہے۔ چلئے ہم آپ کی قسم توڑنا نہیں چاہتے۔ ہندستانی اگر مہنگے ہیں تو پاکستانی ہوٹل چلتے ہیں۔ میرے لاکھ سمجھانے پر بھی وہ نہ مانے حالانکہ نظام بھائی کے کمرے میں اکثر ان کے کومل ہاتھوں کا پکایا ہوا کانپوری پکوان میں نے کھایا تھا۔ ان پکوانوں تلے میں دبا ہوا تھا مگر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ بہت ڈھونڈنے پر ہم لوگوں کو ایک پاکستانی ہوٹل ''شیزان'' مل ہی گیا۔ ہوٹل بہت اچھا اور قاعدے کا تھا۔ اس کے مینو کارڈ نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس میں انگریزی میں مختلف پکوانوں کے اردو نام کچھ اس ڈھنگ سے پیش کئے گئے تھے کہ واجد علی شاہ کے دسترخوان کی فہرست بھی اس کے آگے حقیر نظر آنے لگی۔ نظام بھائی نے کیا آرڈر دیا اور ہم نے کیا کھایا کچھ یاد نہیں کیوں کہ اس دوران میں قلم کاغذ سنبھالے ان پسندیدہ پکوانوں کے منتخب نام نوٹ کر رہا تھا۔ آیئے اس دعوت میں قیمت سمیت آپ کو بھی شامل کرلوں۔ آپ ان کی قیمت پر خدارا نہ جائیں۔ یہ دیکھیں کہ دیارِ غیر میں اپنی وضع قطع اور اپنے شاہی دسترخوان کو بچائے رکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ چند نام آپ بھی سن لیجئے۔ عالم گیر مسئلہ روٹی کا ہوتا ہے اس لئے ہم روٹی سے شروع کرتے ہیں۔

نانِ بابری پندرہ روپئے فی عدد، مرغ قورمہ شاہی نوے روپئے فی پلیٹ، سمندر کی شہزادی قلیہ ماہی ایک سو چالیس روپئے فی پلیٹ، سوختہ جھینگا شاہی ایک سو چالیس روپئے فی پلیٹ، مرغ تکہ لاہوری بیاسی روپئے فی پلیٹ، سیخ کباب سلطانی ایک سو دو روپئے فی سیخ، سیخ کباب کابلی سو روپئے فی سیخ، کباب آہو خیبری اسی روپئے فی سیخ، شامی کباب لکھنوی ستر روپئے فی پلیٹ، یخنی مرغ شاہی فی پیالہ پچیس روپئے، بریانی آراستہ دہلوی پچاس روپئے فی پلیٹ، کابلی چنا پلاؤ تیس روپئے فی پلیٹ، بنارسی سبزی پال آلو میتھی تیس روپئے فی پلیٹ، تر و تازہ سلاد پچیس روپئے فی پلیٹ، کھٹا میٹھا رائتہ پچیس روپئے فی پلیٹ، حلوہ ممتاز محل تیس روپئے فی طشتری، شیزان پستہ قلفی تیس روپئے فی پیالہ، دل نشیں کھیر خاص تیس روپئے، گرم چائے پندرہ روپئے فی کپ وغیرہ وغیرہ امریکہ دن دونی رات چوگنی ترقی پر ہے اس لئے کوئی عجب نہیں کہ جب تک آپ ان قیمتوں کو پڑھیں مزید سو فیصد اس میں اضافہ ہو چکا ہوگا۔ آپ برائے کرم معلوم کر کے اس نعمت کدے میں داخل ہوں۔

پاکستانی منتظمین اور ہندستانی باورچیوں نیز مغل پکوان نے اس ہوٹل کا نام زندہ رکھا ہے۔ میری ناقص رائے میں ہندستان اور پاکستان کے درمیان ثقافتی تعلقات کو مضبوط اور پائیدار بنانے میں ایسے ہوٹل سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دیارِ غیر میں اور فرنگی قدروں کے بیچ اردو کی جو خدمت یہ لوگ کر رہے ہیں اردو کی آئندہ تاریخ میں ان کا نام سنہری حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہے۔



ڈی سی کے فضائی بالا خانے

دریائے پوٹومیک (Potomac) بڑی متانت ودل فریفتگی کے ساتھ واشنگٹن ڈی سی کے کنارے رواں دواں ہے۔اس شہر میں نہ صرف اہم ترین تاریخی یادگاروں کی بھرمار ہے بلکہ جدید طرز کی پرتمکنت اور شاہانہ عمارتیں قطار سے صف بستہ کھڑی ہیں۔وقت کی تنگی اور دوستوں کی مصروفیت کی وجہ سے میں نے گائیڈیڈ ٹور' والی بس میں اپنی سیٹ بک کروائی اور صبح ہی سے کیمرہ، قلم اور نوٹ بک سنبھالے تنہا نکل پڑا۔ورجینیا ایونیو پر ٹورسٹ بس میری منتظر تھی۔ایک وجیہ گائیڈ مائیک پر راستے کی تفصیلات بتا رہی تھیں۔کچھ دور چل کر ہم ایک چورنگی پر آئے اور محترمہ نے بتایا کہ آپ کی داہنی طرف۔سبھوں کی گردن داہنی طرف مڑگئی تو سامنے واٹر گیٹ مینشن تھا جو واٹر گیٹ اسکینڈل کے لئے مشہور ہے۔ہم لوگ دو منٹ کے لئے وہاں رکے۔ایک بہت ہی وسیع وعریض عمارت جس کے گیٹ پر بڑے بڑے خوبصورت فوارے اور نقلی جھرنے بنے ہوئے تھے۔سبھوں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی ایک تصویر وہاں کھینچوا ہی لی۔سفر پھر شروع ہوا اور بس انڈی پینڈنس ایونیو سے گزر رہی تھی۔دور سے ہی ایک وکٹوریہ میموریل نما عمارت نظر آرہی تھی مگر جوں جوں ہم قریب پہنچے اس کی شکل بدلتے بدلتے کیپیٹل (The Capital) میں تبدیل ہو چکی تھی۔یہاں بھی پانچ منٹ کا بریک ملا۔یہ امریکہ کی راجیہ سبھا ہے جہاں قانون سازی اور امریکی مجلس یا سبھا کو سر جوڑ کر کسی مسئلے پر بحث کرتے دیکھا۔اجلاس میں تقریروں کے تیر ونشتر دیکھنے کا موقع نہیں ملا اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ ہماری اندرسبھا کی طرح جوتے چپل اور لات گھونسے والا مباحثہ نہیں ہوتا۔شریفوں کو یہاں پندرہ منٹ سمجھنے بوجھنے کا موقع دیا جاتا ہے مگر ہم شریف ہوتے تو بس سے کیوں جاتے۔ایک بار پھر بس ہم سبھوں کو بھر کو چل پڑی اور سیدھے واشنگٹن منومنٹ پر اتارا۔یہ ہمارے شہید مینار سے کم نہیں۔۵۵۵ فٹ اونچا۔اوپر لفٹ سے پہنچے۔جب صاف اور ٹھنڈی ہوا لگی تو دماغ کھلا اور یاد آیا کہ شاید اسی یادگار کو ہر خاص وعام تک ساری دنیا میں پھیلانے کے لئے ۵۵۵ برانڈ کی سگریٹ کا وجود ہوا۔بس کے ہارن سے پتہ چلا کہ میں واحد فرد ابھی تک باہر ہوں۔سب یادگار چھوڑ کر مجھے دیکھ رہے تھے۔یہاں سے میرا موڈ خراب ہوا اور فرار کے بارے میں سوچنے لگا۔ابھی میرا منصوبہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ ہم لنکن میموریل پہنچ گئے۔اس عمارت کے کشادہ ہال میں صدر ابراہیم لنکن کا ۱۹ فٹ اونچا سفید سنگ مرمر کا قد آدم مجسمہ جلوہ افروز تھا۔اس عظیم نجات دہندہ کی خدمات کو امریکی نسلیں کیا پوری دنیا تسلیم کرتی ہے۔یہاں سے پنسلوانیا ایونیو سے گزرتے ہوئے ہم وہائٹ ہاؤس کے سامنے رکے۔میں وہائٹ ہاؤس کی سیر کر چکا تھا اس لئے اندر نہیں گیا۔باہر کا ماحول بھی کم دلچسپ نہ تھا۔کچھ ہپی سے بالاتر نسل کے لوگ وہیں بوریا بستر ڈالے خیمہ زن تھے۔ان کے احتجاج کا انداز نرالا تھا۔نہ وہ نعرے بازی کررہے تھے نہ ہی عوام سے گفتگو کررہے تھے۔کچھ نے بڑے بڑے بورڈ پر کیا کچھ نہ لکھ رکھا تھا۔ایک پیر مغاں نے اپنے آگے کچھ اس طرح لکھ رکھا تھا۔ God is Dead, and we are alive کچھ بچیاں بڑے زرق برق لباس میں جھنڈیاں ہاتھوں میں لئے چہک رہی تھیں۔بیگم نینسی ریگن اگر آپ اپنے دسترخوان پر ملین ڈالر جھونک دیں گی تو اس سردی میں بوڑھی نسل کا کیا ہوگا۔'' کچھ لوگ جناب اعلیٰ ریگن کی شان میں قصیدہ خوانی کررہے تھے۔کسی کا بورڈ تھا'' کمیونزم آؤٹ آف امریکہ''۔کوئی'' ایل سلواڈور کو بچانے کے لئے پریشان تھا۔'' ایک میری طرح کے صحت مند جوان باقاعدہ سوکر احتجاج کر رہے تھے مگر ان کے پاس جو بورڈ لکھا رکھا تھا اس بھیڑ میں مجھے سب سے اچھا لگا جس میں لکھا تھا'' اگر تم مسئلہ کا حل نہیں تو تم خود ایک مسئلہ ہو''۔

If you are not part of solution,you are problem!

میرا منصوبہ اب تک ایک مسئلہ تھا اور فرار کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ شش و پنج میں ہم پھر چل پڑے۔ محترمہ نے بغیر بس رکوائے ایک بار پھر داہنی طرف ہم سبھوں کی گردنیں گھما دیں۔ ہمارے سامنے Fedral Bureau of Investigation تھا جہاں ہر جمعہ کو (پتہ نہیں جمعہ بعد یا جمعہ سے پہلے) Big men خطرناک مجرموں کو زدوکوب اور ان کی برین واشنگ کرتے ہیں۔ صد افسوس کہ الفرڈ ہچکاک اسٹائل کا شو ہم منگل ہونے کی وجہ سے نہ دیکھ سکے۔ اس کے بعد مجرم جہاں جاتے ہیں وہاں ہم سب گئے یعنی آرلنگٹن نیشنل قبرستان...... کتنی عجیب بات ہے کہ ہمارے قبرستان والے اب تک بانس اور چٹائی کی زیادہ قیمت وصول کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور مٹی ڈلوانے اور چرانے کے چکر میں پریشان ہیں جب کہ یورپ اور امریکہ والے قبرستان تک کو عجائب خانہ بنائے بیٹھے ہیں اور داخلے کا ستر سینٹ لیتے ہیں۔ خیر اس قبرستان میں امریکہ کے بہت سے قومی ہیرو آرام فرما ہیں۔ یہیں صدر جان ایف کنیڈی بھی ابدی نیند سو رہے ہیں۔ کچھ فاصلے پر ''نامعلوم سپاہیوں کا مقبرہ'' ہے جس پر گارڈ پہرہ دے رہے ہیں۔ جب دوسرے سیاح دیگر مقبروں کی زیارت کر رہے تھے تو میں اگربتی لانے کے بہانے سے دبے پاؤں بصد احترام قبرستان سے باہر نکل آیا اور گائیڈ کی نگاہ سے بچتا ہوا کچھ ہی دوری پر ایک کیفے میں داخل ہوا اور کنگ برگر کا آرڈر دیا اور نقشہ پھیلا کر خود کو ڈھونڈنے لگا کہ میں کہاں؟ بڑی مشکلوں سے اندازہ کر پایا کہ میں شہر واشنگٹن سے صرف اٹھارہ میل دور ورجینیا میں ہوں۔ امریکی اصطلاح میں Junk food سے فارغ ہو کر میں جین پینٹ پر ہاتھ صاف کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ بس میرا انتظار کر کے جا چکی تھی۔ میں کچھ دیر جارج ٹاؤن (George Town) کے تنگ کوچوں اور سایہ دار درختوں کے درمیان ٹہلتا رہا۔ یہاں اٹھارہویں صدی کا ماحول اب تک موجود تھا۔ میں پوچھتا ہوا ایک ڈی لکس بس کے اڈے پر پہنچا اور ایک ڈائرکٹ بس سے مال روڈ پہنچا۔ دن بھر کے آوا گون سے تھک گیا تھا مگر واشنگٹن کا آخری دن تھا۔ دوسرے دن مجھے ہوسٹن ٹکساس ہوتے ہوئے نیویارک جانا تھا۔ اب صرف ایک چیز قابلِ دید رہ گئی تھی۔ وہ تھی اسمتھ سونین انسٹی ٹیوشن۔ یہ ادارہ عوامی تعلیم برائے آرٹس، سائنس اور تاریخ کی ریسرچ اور نمائش کے لئے ۱۸۴۶ء میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا اور پیچیدہ عجائب خانہ ہے۔ اس ادارے کے تحت تیرہ عجائب خانے اور نیشنل چڑیا گھر میں تقریباً سات کروڑ مختلف موضوعات کی اشیاء اور نمائشی نمونے عوام کی دلچسپی کے لئے موجود ہیں جن کا بیشتر حصہ اسکالروں اور سائنس دانوں کی تحقیق کے لئے مخصوص ہے۔ ان عجائب خانوں میں سے کچھ واقعی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلا اسمتھ سونین محل ہے۔ دوسرا نیشنل میوزیم آف امریکن ہسٹری جس میں داخلہ مفت تھا۔ امریکی پرچم نے میرا استقبال کیا۔ گراؤنڈ فلور پر ہی امریکہ کے سرون پوت جیسے قابلِ فخر سائنس دانوں کی معرکۃ الآرا ایجادات نمائش کے لئے لگی تھیں۔ ان میں الگزانڈر گراہم بیل کا پہلا ٹیلی فون، تھامس ایڈیسن کا پہلا بجلی بلب، پہلا بھاپ کا انجن اور مختلف امریکی لوک دستکاری وغیرہ کے نمونے سجے ہوئے تھے۔ بادبانی کی مہم، بجلی کی تیاری، مشینوں کا استعمال، ایک بڑے ہال میں امریکی جانبازوں کے تمغے اور قدآدم تصویریں آویزاں تھیں۔ یہیں امریکی صدور کی بیگمات کے گاؤن Gowns بھی جو دورِ عروج میں زیب تن کئے تھے پتہ نہیں کس مصلحت کی بنا پر ٹنگے تھے۔ جن میں پہلی بیگم مارتھا واشنگٹن سے لے کر روزالین کارٹر تک شامل ہیں۔ میں باہر نکلا دس قدم کے فاصلے پر نیشنل میوزیم آف امریکن آرٹ تھا۔ معلوم ہوا کہ اسمیں کوئی ۲۶ ہزار فن پارے اٹھارہویں صدی سے اب تک کے مصوروں کے نمائش میں لگے ہیں مگر میں ان سے مستفیض نہ ہو سکا اور نیشنل ایئر اینڈ اسپیس میوزیم کی طرف چل پڑا۔ اس کے لئے میں صبح ہی سے تیار تھا۔ یہ عوام کے لئے ہوائی بالا خانہ ہے۔ ہوائی جہاز یا فلائی مشین کے نزول سے لے کر معراج یعنی تسخیر قمر تک کا ایک شوکیس ہے۔ اس میں تیس کشادہ گیلریوں میں تقریباً ۳۰ ہزار نمونے، نقشے، تصویریں اور ماڈل رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں ۱۹۵۳ء رائٹ فلائر کا پہلا جہاز جو بحر اٹلانٹک کے پار اترا تھا۔ جسے Spirit of st. Lois کہتے ہیں۔ جان گلین کا Friendship اور ساتھ ہی اپولو-۱۱ کمانڈ موڈیول اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں۔ اپولو سویوز اسپیس

کرافٹ Apollo Soyuz Spacecraft بھی رکھا ہوا ہے۔ سیاحوں کو اجازت ہے کہ وہ ان جہازوں کو چھو کر دیکھیں اور تصویریں اتاریں۔ ایک اسکائی لیب اور بیٹل ورک شاپ (Skylab Orbital workshop) میں داخل ہو کر کل پرزوں کو گھمائیں اور چاند کی زمین سے لائے ہوئے چٹان کے ٹکڑے کو چھو کر تسلی کر لیں۔ مجھے یاد آیا کہ کلکتہ میں بھی اسی طرح کے پتھر نمائش کے لئے بھیجے گئے تھے۔ کئی بار کی کوشش کے باوجود میں اس کی زیارت سے محروم تھا۔ عوام کی بھیڑ اور پولس کی لاٹھی نے مجھے باز رکھا تھا مگر ابھی یہ بے جان چاند کے ٹکڑے میرے سامنے پڑے تھے اور میں چاہتے ہوئے بھی انہیں چھونے کی زحمت گوارا نہیں نہیں کر رہا ہوں۔ اس چیمبر کے ساتھ ہی اسکرین اور ٹی وی پر ہوائی جہاز کی صنعت اور تاریخی پہلو پر فلم اور لکچر چل رہے تھے۔ چند گیلریوں میں ۱۹۱۳ء کے ہیلی کاپٹر اور اس سے بھی پہلے ہوائی غبارے اور ہلکے پھلکے ایئر شپ کی پوری داستان نظر کے سامنے تھی۔ سامنے ایک میوزیم شاپ کھلی تھی جہاں ہسٹری آف ایئر پلین سے متعلق ڈاک کے ٹکٹ اور فرسٹ ڈے کور اور بڑے پوسٹر اور رنگا رنگ تصویریں نمائش اور سیل کے لئے لگی تھیں ایک حصہ میں امریکی بحریہ کے لڑاکا طیارے جٹ پلین اور دوسری جنگ عظیم کے دوران استعمال کئے گئے لڑاکا جہاز بھی رکھے ہیں۔ ایک جگہ کمپیوٹر کے ذریعہ سیاحوں کو مریخ اور زہرہ کی سیر کرائی جاتی ہے۔ ساتھ ہی نظام شمسی پر معلوماتی لکچر بھی دیا جاتا ہے۔ ''Spacearium'' میں ہفت آسمان کی تہہ در تہہ اور انجان سیاروں کے تجسس کا حال ساتھ ہی اس میں استعمال کئے گئے آلے اور کل پرزے اور بندر سے لے کر حضرت انسان تک کا خلاؤں میں بھٹکنے کا کل احوال افشاء کیا گیا ہے۔ میں تقریباً تین گھنٹہ فضائی بھول بھلیوں میں دن بھر کی تھکن بھول کر چھوتا اور دیکھتا رہا۔ شام کے پانچ بجے پاؤں اکھڑنے لگے اور میں اس عظیم عجائب گھر سے باہر آیا۔ میرے خیال میں اسے اچھی طرح دیکھ لینے کے لئے کم از کم ہفتہ چاہئے تھا۔ جارج واشنگٹن کے دل نشیں شہر سے دل بھر گیا تھا۔ کل صبح مجھے سفر کرنا ہے۔ میں نے ٹیکسی لی اور سیدھا کمرے میں آیا۔ راستہ میں پتہ نہیں کس طرح ایک شعر ندا فاضلی کا میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا :

نقشہ اٹھا کے کوئی نیا شہر ڈھونڈیئے
اس شہر میں تو سب سے ملاقات ہو چکی



مجاہد کے ساتھ ایک شام

میرے معزز قارئین اس مضمون کے عنوان سے ضرور چونک پڑیں گے کہ ایک آوارہ کوئے بتاں اور انجانی ڈگر کا متلاشی آوارہ گردی چھوڑ کر جہاد کا نام کیوں لے بیٹھا؟

بس اتفاق کہئے کہ ایک اجنبی نے ایک ملاقات میں سحر کر دیا اور وہ امرت پلایا کہ اب تک اس کے سرور سے سرشار ہوں ـــ بات امریکہ کے غیر امریکی ماحول کی ہے۔ میں واشنگٹن ڈی سی سے ہوسٹن جا رہا تھا۔ جارج واشنگٹن یونیورسٹی کمپس میں رات دس بجے میں ٹیکسی کے انتظار میں کھڑا تھا۔ ساتھ ہی ایک ساتھی کا انتظار بھی تھا اس لئے جو ٹیکسی مجھے دیکھ کر رکتی میں اشارے سے منع کر دیتا۔ اتنے میں ایک ٹیکسی آئی اور میں نے منع کیا مگر ڈرائیور نے گاڑی روک دی اور باہر نکل آیا۔ اس نے چند لمحے مجھے گھورا مجھے تشویش ہوئی کہ معاملہ کیا ہے۔ رات کا وقت، سنسان علاقہ اور سامنے ایک حبشی جوان۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا وہ خراماں خراماں چلتا ہوا قریب آیا اور اچانک پوچھ بیٹھا Brother, are you Muslim (بھائی کیا آپ مسلمان ہیں)۔ پہلے میں نے اپنے حواس درست کئے۔ حیرت اور خوشی کے ملے جلے لہجے میں جواب دیا Yes, I am Muslim ہاں میں مسلمان ہوں۔ اس کے تپے ہوئے تانبے جیسے سخت چہرے پر ایک رنگ آیا اور خوش ہو کر اس نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھا دیا۔ I am Md. Mujahid میں محمد مجاہد ہوں۔ میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا اور کہا آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ مگر آپ نے یہ کیسے جانا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا کہ آپ کی داڑھی اور آپ کا چہرہ بتا رہا ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ میں فطرتاً جذباتی ہوں بڑھ کر اس مرد مومن کو گلے لگا لیا۔ میں دل میں سوچ رہا تھا کہ میرے ساتھی اور کرم فرما کبھی میری داڑھی کو نکسلائٹ، کبھی رجنیش تو کبھی آنند مارگی کہنے سے بھی چوکتے۔ خوب ع

یاروں کو تجھ سے حالی کیا بدگمانیاں ہیں

یاروں کو کیا کہئے خود میں بھی اپنی داڑھی کو پوری طرح سمجھ نہیں پایا تھا۔ برادر مجاہد نے سکوت توڑا اور کہا "آپ شاید کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ کیوں نہ ہم گاڑی میں بیٹھ کر بات کریں۔ مجھے خوشی ہوگی۔ جب آپ کے ساتھی آجائیں گے تو آپ جہاں کہیں گے میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔ میرا موڈ یکسر بدل چکا تھا۔ یورپ کی یادوں کو ذہن سے جھٹک کر میں نے خود کو ماحول میں ضم ہونے کے لئے تیار کر لیا۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ فلائٹ کا ٹائم ہو رہا تھا اس لئے مزید انتظار مناسب نہ تھا۔ میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ایرپورٹ چلنے کو کہا۔ اپنے بارے میں مختصر طور پر بتایا کہ میں ایک ہندوستانی Freelancer ہوں۔ یورپ کی سیر کے بعد امریکہ آیا ہوں اور فی الحال ہوسٹن ٹکساس کے لئے طیارہ پکڑنا ہے۔ خیر کار چلاتے ہوئے اس نے بڑے شوق سے بتایا کہ تین سال پہلے وہ مائیکل Michel تھا۔ ایک معزز عیسائی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک بڑی یہودی فرم میں سیلس ایگزیکیٹو Sales Executive کا کام کر رہا تھا۔ زندگی آرام سے گزر رہی تھی مگر تمام عیش و آرام کے باوجود سکون نام کی چیز سے بے بہرہ تھا۔ ایک ساتھی نے اسلام کے بارے میں کچھ بتایا۔ میں نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا اور پھر دو سال کے گہرے اور سنجیدہ مطالعہ نے مجھے وہ سکون دیا جسے میں ایئر کنڈیشنڈ اور فوم کے نرم بستر پر ڈھونڈ رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج میں مسلمان ہوں۔ میں بت بنا اپنے اجنبی دوست کی باتیں سن رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ایک سحر انگیز قوت ہے جس نے مجھ سے قوت گویائی چھین لی ہے۔ وہ بول رہا تھا اور تمام باتیں میرے دل کے نہاں خانے میں جذب ہو رہی تھیں۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا: "مگر اسلام قبول کرتے ہی میرے لئے پریشانیوں کے دروازے کھل گئے۔ سب سے پہلے گھر والوں نے سمجھایا، ڈرایا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اور پھر سوشل بائیکاٹ کر دیا۔ میں نے اپنا گھر چھوڑ دیا اور ایک ہوسٹل میں رہنے لگا۔ کمپنی والے مذاق اڑانے لگے۔ مجھے ظہر کی نماز کی فرصت نہیں دی جاتی۔ میرے ساتھی مجھے پاگل کہنے لگے۔

اسی دوران مجھے ایک حدیث پڑھنے کا اتفاق ہوا جس نے میری ساری پریشانی دور کر دی۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ غلامی سے بہتر اپنا کام ہے۔ میں نے کچھ روپے کا انتظام کیا اور سکنڈ ہینڈ ٹیکسی خرید لی۔ آج میں اس کا مالک ہوں اور آزاد ہوں۔ نہ مجھے کسی کی غلامی کے تحت نماز کی فرصت مانگنی پڑتی ہے نہ ہی مجھے دوستوں کی تنگ نظری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

راستہ آدھے سے زیادہ طے ہو چکا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم ایرپورٹ پہنچنے والے تھے۔ برادر مجاہد کی آواز جیسے دور سے آرہی تھی۔ وہ اچانک پوچھ بیٹھا ''برادر! میں نے پڑھا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ہندستان میں بڑا ظلم ہوتا ہے۔ مراد آباد، علی گڑھ، بہار وغیرہ میں ایک منصوبہ بند پروگرام کے تحت فساد ہوتا ہے۔' اس نے میری طرف دیکھا اور کچھ جواب دینے کے بجائے میں نے گردن ہلا دی۔ میں خود سوچ رہا تھا کہ یہ سب کیوں ہوتا ہے۔

برادر مجاہد پھر پوچھ بیٹھا ''کیا مسلمانوں کا ایک پلیٹ فارم Platform ہے تمہارے یہاں۔'' میں خاموش تھا :

جو دِل کا حال ہے
وہی دِلّی کا حال ہے

ایرپورٹ آچکا تھا۔ اس نے گاڑی کنارے لگاتے ہوئے کہا:

You must do something, like jihad!

گاڑی سے اترتے ہوئے میں دل پر ایک بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ مجاہد سے ملاقات جس قدر خوشی کا باعث تھی۔ اتنا ہی میں الجھ گیا تھا۔ میں نے پرس نکالا اور پانچ ڈالر اس کی طرف بڑھایا۔ وہ مجھے ڈیڑھ ڈالر واپس کر رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ وہ اس رقم کو رکھ لے مگر اس نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا :

No brother, I have got the Halal Rizaq.
(نہیں بھائی مجھے حلال رزق مل گیا)

پتہ چلا کہ اس دن صبح سے اس کی گاڑی میں کوئی مسلمان بھائی نہیں بیٹھا تھا اس لئے وہ میری خاطر کر رہا تھا۔ شاید یہ بات آپ کو عجیب لگے۔ خود مجھے بھی کچھ دیر کچھ یقین سا نہ آیا مگر یہ ایک حقیقت تھی۔ میں اپنے جذبات بلکہ تاثرات قلمبند کرنے سے قاصر ہوں۔ کاش میں اس کی صحیح عکاسی کر سکتا! بڑی گرمجوشی سے مجاہد نے مجھے رخصت کیا۔ میرے اندر کا انسان مجھ سے جنگ کرنے پر آمادہ تھا۔ میں بڑی مشکلوں سے جہاز تک پہنچا۔ مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ کب جہاز فضا میں تیرنے لگا۔ میرا ذہن طیارے سے بھی اونچے خلاء میں پرواز کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ رب العزت جسے ہدایت عطا کر دے وہ مجاہد ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے کسی خاص قوم یا مخصوص جغرافیائی حد مقرر نہیں۔ ان تمام باتوں کے بعد میرے خالی ذہن کے ایک کونے میں ایک چھوٹا سا سوال گھر کئے ہوئے تھا۔ ''جہاد کیا ہے؟'' میرے خیال میں کسی مخالف قوت کے مقابلے میں کشمکش یا پھر گھر سے لے کر آفاق تک ان انسانوں سے لڑنا جن کے نظریات، رجحانات، اصول وضوابط، رسم ورواج، طرزِ تمدن اور قوانین، معیشت و معاشرت دینِ حق سے متصادم ہوں۔ یہ مجاہدہ—ایک یا دو دن کا نہیں، عمر بھر کا ہے۔ ہر لمحہ ہر میدان میں، زندگی کے ہر پہلو اور ہر محاذ پر۔ ضروری نہیں کہ اس محاذ آرائی میں خون خرابہ ہو—مجھے یاد آرہا ہے کہ حسن بصریؒ نے فرمایا ہے'' آدمی جہاد کرتا ہے خواہ کبھی ایک دفعہ بھی تلوار نہ چلائے۔'' مگر ہم سب پر خواہش غالب ہے۔ کیا ہم کسی محاذ کے بجائے صرف اپنے نفس کو زیر کر پائیں گے۔ اے خداوند ہمیں اپنے نفس اور مخالف قوتوں کے مقابلہ میں ہمہ گیر اور ہر جہتی کشمکش میں مبتلا کر دے۔ اے کاش فی الحال حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

●●●

دیارِ افرنگ میں ایمان کی باتیں

پین ایم PAN AM کے ۷۰۷ طیارے سے نکلتے وقت محسوس ہو گیا کہ سردی نہیں ہے اور ہوسٹن کی فضا خوشگوار ہے شام کے سات بج رہے تھے۔ لگیج کلیم سے سے سامان وصول کرنے سے پہلے میں پبلک فون کی طرف بڑھا۔ دس سینٹ کا سکہ ڈال کر دھڑکتے دل کے ساتھ 713-524-6615 اسلامک سوسائٹی کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجی اور السلام علیکم کی آواز پر پہلے میں چونکا پھر آواز پہچانتے ہوئے وعلیکم السلام کے ساتھ اپنے نزول کی اطلاع دی بات جناب م۔نسیم صاحب سے ہوئی تھی۔ م۔نسیم کسی فرد واحد کا نام نہیں آپ بذات خود ایک انجمن ہیں۔ ایک مکمل تنظیم، ایک تشنہ تحریک، بے نیاز، مخلص اور سادہ منش، صاحب ذوق انہیں ایڈیٹر پرنٹر، پبلشر نئی نسلیں نیز ان کے مقصدی افسانوں سے جانتے ہیں۔ (اب جناب افسانوں سے منقطع ہو کر حقیقی کرداروں کو سدھارنے میں سرگرداں ہیں) ان کو اب روز جزا یا اسلامی فکر کی فکر ہے۔ کسی زمانے میں ان کے صاحبزادے میرے ساتھی تھے اب مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں ان کے بیکار ساتھیوں میں نہیں پرستاروں میں سے ایک ہوں۔ م۔نسیم صاحب ان دنوں امریکہ کے اسلامک سرکل شہر ہوسٹن Islamic circle of Grt Houston میں ڈائرکٹر آف ایجوکیشن Director of Education کے عہدے پر فائز کئے گئے ہیں۔ میں نے نسیم صاحب سے کہہ دیا کہ تکلف برطرف بندہ خود حاضر ہوتا ہے مگر دو لکھنؤ والے ایک جگہ ہوں تو بات تکلف سے شروع ہو کر تکلیف پر ختم ہوتی ہے وہ شاید کسی کلاس میں مصروف تھے اس لئے فوراً آنے سے قاصر رہے۔ مجھے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اس لئے انہوں نے مجھے آدھے راستے تک آنے کا ٹھکانہ بتا دیا اور کہا کہ وہ وہاں سے مجھے لینے آجائیں گے۔ میں نے چار ڈالر ادا کر کے ایک لیمو زین ایئرپورٹ سے لی اور ڈاؤن ٹاؤن Down Town تک تقریباً چالیس منٹ میں پہنچ گیا۔

ہوٹل حیاٹ ریجنسی کے اسٹاپ پر میں تقریباً گھنٹہ بھر منتظر رہا۔ بوریت تو ہوئی مگر معاملہ مولانا کا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ پریشانی کے عالم میں ٹہل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ مولانا کو امریکی ہوا لگ ہی گئی کہ اتنے میں دیکھا کہ ایک چھوٹی سی نیلی فیٹ کار رکی اور حضرت شان اودھ بنے ٹوپی اور شیروانی میں جلوہ افروز ہوئے اور بڑے تپاک سے گلے لگا لیا بھلا کس کی مجال ہے کہ اب گلہ کرے۔ خیریت دریافت کی اور فوراً سامان وغیرہ اٹھانے لگے مجھے اور میرے سامان کو اسی چھوٹی گاڑی میں ٹھونس کر منزل کی طرف طرف روانہ ہو گئے۔ گاڑی ایک ایرانی طالب علم حبیب کی تھی اور وہی ڈرائیونگ کر رہے تھے برادر حبیب سے تعارف ہوا مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ راستہ بھر ہندستان کی بات اور میرے سفر کی تفصیل سنتے رہے۔ بہت خوش تھے مجھے بھی ایک روحانی مسرت حاصل ہو رہی تھی باتوں میں وقت کا پتہ نہیں چلا اور ہم اسلامک سنٹر پہنچ گئے یہ علاقہ چونکہ شہر سے دور تھا اس لئے ہر سو خاموشی طاری تھی۔ اسلامک سنٹر ایک کاٹیج نما مکان تھا یہ دراصل ایک مسجد تھی اور امریکہ میں مسجد کو اسلامک سنٹر کہتے ہیں اور یہ ہماری گنبد اور میناروں والی مسجد کی طرح نہیں تھی۔ شاید اس کی وجہ گرجے ہوں جہاں عبادت کے علاوہ بھی سوشل اجتماعات ہوتے رہتے ہیں اس کاٹج نما مسجد میں ایک بڑا ہال نماز کے لئے مخصوص تھا مرد و زن کے لئے وضو اور باتھ روم کے لئے الگ الگ کمرہ تھا۔ ایک اسٹور روم جس میں مختلف ضروریات زندگی موجود تھی۔ ایک سامنے کا کمرہ آفس کے طور پر استعمال ہوتا رہا تھا جہاں قرآن مجید اور اسلامی موضوعات کی دیگر کتابیں انگلش، عربی اور اردو میں دستیاب تھیں ساتھ ہی ٹوپی، تسبیح، جانماز وغیرہ برائے فروخت لگی ہوئی تھیں اندر ایک صحن اور اس سے متصل ایک اور چھوٹا ہال جس میں بچوں کے لئے کلاس ہوتی ہے نیز کسی خاص موقع پر اس میں دعوت کا انتظام ہوتا ہے۔ ایک منزل پر دو کمرے تھے، ایک مہمان خانہ دوسرا لائبریری روم نسیم صاحب کے قیام کیلئے تھا۔ میں بھی اس میں جا بسا، نسیم صاحب چونکہ تنہا تھے اس لئے کھانا اکثر باہر ہی کھاتے تھے۔ ہم لوگوں نے بھی رات کا کھانا ایک قریبی کیفے میں کھایا۔ شاید ہم نے فرائڈ چکن کھایا تھا

کیونکہ باتوں میں کچھ یاد نہیں رہا رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ہم لوگ سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی، نسیم صاحب نے واعلیکم السلام کے ساتھ ہی انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ پتہ چلا کہ کسی بچے کا انتقال ہو گیا ہے۔ ہم لوگ شہر سے چونکہ بہت دور تھے اور نسیم صاحب کے پاس گاڑی بھی نہیں تھی اس لئے اتنی رات گئے جانا ممکن نہ تھا۔ صبح فجر کے نماز کے تجہیز وتکفین کا وعدہ کر کے ہم لوگ سو گئے۔ فجر کی اذان سے آنکھ کھلی دیکھا کہ نسیم صاحب اذان دے رہے ہیں۔ اس وقت سنٹر یا مسجد پر صرف چار افراد موجود تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر درس حدیث میں مشغول تھے کہ دو حضرات نسیم صاحب کو لینے آ گئے ان میں سے ایک بچے کا باپ تھا نسیم صاحب نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ ہم لوگ گاڑی میں روانہ ہوئے۔ راستہ میں ان صاحب نے بتایا کہ بچہ ایک ماہ کا ہے۔ پیدائش کے بعد ہی بیمار ہو گیا اور آخر کو اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ہوسٹن میں مسلمانوں کا قبرستان شاید نہیں ہے۔ ایک عیسائی قبرستان میں ایک پلاٹ مسلمانوں نے خرید لیا ہے جہاں ان کی میتیں دفن کی جاتی ہیں۔ ویسے قبرستان کا عملہ اور دیگر کارکن عیسائی ہیں۔ نسیم صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا میں میت کو نہلانے اور کفن وغیرہ پہنانے سے واقف ہوں یا نہیں۔ مجھے شرمندگی کی جگہ افسوس ہوا کیونکہ میرے والد اور دادا دونوں نے جب اس دار فانی سے کوچ کیا تو میں رونے رلانے میں وقت ضائع کر رہا تھا۔

ہمارے سماج میں یہ رسم ابھی تک عام ہے کہ کرائے کے غسال آ کر آخری رسوم ادا کرتے ہیں۔ نسیم صاحب کے ساتھ جب قبرستان کے اس مخصوص کمرے میں داخل ہوا جہاں جنازہ رکھا تھا تو دل نہ معلوم کس ڈر سے دھڑک رہا تھا مگر سامنے میز پر ایک خوبصورت اور معصوم فرشتے کو ابدی نیند سوتا دیکھ کر دل میں بے اختیار خواہش پیدا ہوئی کہ کاش یہ بچہ زندہ ہوتا مگر مشیت ایزدی کے سامنے کس کا چارہ ہے۔ بچے کو Embalm کر کے رکھا گیا تھا یعنی لاش کو دوا اور خوشبو لگا کر سڑنے سے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ نسیم صاحب نے پہلے کفن پھاڑا اور پھر ہم دونوں نے مردے کو غسل دیا۔ نسیم صاحب تفصیل سے مجھے ساری باتیں بتا رہے تھے۔ جنازہ تیار کر کے ہم لوگ نے نماز جنازہ پڑھی اور جب باہر آ رہے تھے تو قبرستان کے انچارج نے ایک کتابچہ دیا جس میں مرتے وقت کی خواہشات اور مرنے کے بعد کی ضروریات کفن وقبر کا انتخاب اور ڈیزائن نیز دیگر تفصیلات درج تھیں کتاب کا نام تھا Facts every family should know جنازہ تیار ہونے کے بعد جہاز کے ذریعہ کسی دوسرے شہر جا رہا تھا کیونکہ اسے خاندانی قبرستان میں دفن کرنا تھا۔ اپنے فرائض سے فارغ ہو کر نسیم صاحب رخصت ہونا چاہ رہے تھے بچے کا باپ بہت شکر گزار تھا اور اشکبار بھی۔ اپنے ہمدردی کا صلہ ایک لفافے میں کچھ رقم کی شکل میں دینا چاہا جسے مولانا نے لینے سے انکار کر دیا اور سمجھا دیا کہ یہ کوئی احسان نہیں بلکہ ان کا دینی فرض ہے۔

راستے میں نسیم صاحب نے بتایا کہ امریکہ میں مرنا بہت مہنگا ہے۔ ایک آدمی کے کفن دفن پر تقریباً بیس پچیس ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ مندرجہ بالا بچے کی embalm کی فیس چھ سو ڈالر تھی میں نے فوراً توبہ کی اور دعا مانگی کی خداوند مجھے سولہ آنا قبرستان عزیز ہے۔ میرا کام وہیں تمام کرنا۔ امریکہ میں آوارگی یا اللہ ہدایت دے دے تو دیں کی فکر تک ٹھیک ہے اس سے آگے اللہ رحم کرے۔ میں رات بھر نسیم صاحب کے بارے میں سوچتا رہا۔ ان کے عزیز واقارب ودیگر لوگ سمجھتے ہوں گے کہ مولانا امریکہ میں مزے کر رہے ہوں گے مگر ایک ہی دن میں ان کی مصروفیت دین کی فکر اور روزانہ کی پریشانیاں دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اگرچہ مولانا (اس لفظ سے انہیں چڑ سی ہے) ہندستان میں بھی کم مصروف نہیں رہتے تھے مگر امریکہ پہنچ کر انہوں نے اپنی مصروفیت ذمہ داریوں اور پریشانیوں کو دگنا کر دیا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ چوبیس گھنٹے سے وہ ایک منٹ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اذان سے لیکر جماعت تک، کفن سے دفن تک، درس حدیث سے تقریر تک، نکاح سے لے کر مسلمان بنانے تک، بچوں کے کلاس سے لے کر بڑوں کے مسئلے تک اور آخر میں اپنا کھانا پکانے سے لے کر پانی بھرنے تک ہر کام میں ہر وقت تیار اور ہشاش بشاش نظر آتے۔ اتنی ذمہ داریوں کو لے کر وہ شخص بذلہ سنج اور ادبی ذوق کا مالک بھی ہے۔ نسیم صاحب بھی کسی سوچ میں گم ہو گئے تھے۔ میں نے سکوت توڑا اور کہا کہ کوئی ایسی گفتگو کریں کہ دل بہلے۔ صبح کے سانحہ سے طبیعت کچھ اداس ہے۔ انہوں نے فرمایا عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ تم تین مواقع پر اپنے قلب کا جائزہ لو۔ قرآن سننے کے وقت، ذکر کی مجلسوں میں اور تنہائی کے اوقات میں اگر تینوں موقعوں پر اپنے پہلو میں دل نہ پاؤ یعنی ان چیزوں میں تمہارا دل نہ لگے اور دل خدا کی طرف متوجہ نہ ہو تو اللہ سے درخواست کرو کہ وہ تمہیں ایک دل مرحمت فرما دے اس لئے کہ تمہارے پاس دل نہیں ہے۔

●●●

امریکہ میں عید قرباں

اکتوبر کا پہلا ہفتہ تھا اور میں پچھلے دس دنوں سے ہوسٹن، ٹکساس نسیم صاحب کے ساتھ اسلامک سنٹر میں مقیم تھا۔ اسلامی تربیت و تعلیم کے ساتھ ساتھ اکثر شام کو ادبی نشستیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ علیگڑھ کے سرور عالم راز صاحب جو پیشے سے انجینئر کے ساتھ ذوق سے شاعر اور شوق سے اچھے کھانے پکانے اور کھلانے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے۔ ان کے ساتھ خوب گزری کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ کھانا پر مدعو کیا اور خود گاڑی لے کر مجھے لے گئے۔ خوب کھلایا ادبی نوک جھونک شعر و سخن کی محفل جمی رہی اور پھر رات کے گیارہ بجے مجھے واپس چھوڑنے تقریباً تیس کیلومیٹر تک اپنی گاڑی سے آئے۔ ہندستان میں ایسی دعوتیں شاید مہاراجے بھی نہ دیتے ہوں۔ اس کی ایک وجہ ان کی محبت ہے دوسری یہ کہ میں بے ''کار'' (Car) تھا۔

۹/ اکتوبر کو عید الاضحیٰ تھی۔ اب تک میں سفر میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ عید کا خیال ہی نہ رہا۔ عید قرباں کی خبر سنتے ہی اچانک گھر والے اور ساتھی اور کلکتے کی یاد ستانے لگی۔ زندگی میں پہلی بار میں عید پر گھر سے باہر بلکہ ہزاروں میل دور پڑا تھا مگر اس بات کی خوشی بھی تھی کہ ایک عظیم ہستی کی قربت مجھے حاصل تھی اور ساتھ ہی کئی عزیزوں سے بڑھ کر چاہنے والے ساتھی دور افتادہ مقام پر میرے ہم زبان تھے۔ ہوسٹن ٹکساس میں ہی تقریباً بیس ہزار مسلمان موجود تھے یہ اور بات ہے کہ ان میں سے پانچ ہزار کلمہ گو پکے مجاہد اور اسلامک سنٹر کی ڈور میں بندھے ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں برابر شریک تھے میں نے سنا کہ عید الفطر کی نماز میں تقریباً پانچ ہزار فرزندان توحید نے نماز پڑھی اور یہاں کے اسٹیڈیم میں جماعت کا انتظام کیا گیا تھا بقر عید کی نماز کے لئے بھی ہفتہ بھر پہلے سے ہی تیاری شروع کر دی گئی تھیں۔ اس کے لئے اسلامک سنٹر آف گریٹر ہوسٹن کی انتظامیہ نے اپنے خبر نامہ '' وائس آف اسلام' Voice of Islam کے ذریعہ تمام اطلاع اور عید گاہ کے طور پر استعمال ہونے والے ٹینس گراؤنڈ کا پتہ نیز وہاں تک پہنچنے کا نقشہ ساتھ ہی کس جگہ گاڑی کو پارک کرنا ہے اور کہاں رکے بغیر آگے بڑھ جانا ہے یہ تمام تفصیلات ایک خبر نامہ میں شائع کر دی تھیں۔ اس خبر نامے کے ساتھ ایک فارم بھی سنٹر کے آفس پر دستیاب تھا جو ایک طرح کے قربانی کے جانور کا آرڈر فارم تھا یعنی آپ کو قربانی کروانا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کے پاس وقت کہاں اس لئے ستر ڈالر کا چیک لے کر اس فارم کو پر کر کے اپنا پتہ وغیرہ لکھ کر جمع کر دیں بس آپ کی قربانی ہوگئی۔ ہاں بھئی۔ اب یہ سنٹر والوں کی ذمہ داری اور کمال ہے کہ وہ پوری قوم کے آرڈر کو سمیٹ کر اتنے بکروں اور بھیڑوں کا انتظام کرے ساتھ ہی قصابوں کی ایک ٹولی کو ٹھیک کرے تاکہ قربانی کے بعد اس کے لوازمات پورے کرائے اور آپ کی کوفت ختم کرے۔ اب یہ آپ کی مرضی ہے کہ آپ پورا بکرا گھر لے جائیں یا صرف اس کی کلیجی۔ ایک مزید اعلان یہ ہوا کہ چونکہ بقر عید جمعہ کو پڑ رہی ہے اور جو کام کا دن ہے لہٰذا جمعہ کی صبح کو نماز تو ہوگی لیکن قربانی اتوار کی صبح کو فلاں کھلے میدان میں ہوگی۔ ساتھ ہی پکنک کا اہتمام ہوا اگر کسی صاحب کو اس پروگرام سے اتفاق نہ ہو تو وہ اپنی عید اور قربانی اپنی مرضی سے کر سکتا ہے مگر پوری قوم اتوار کی صبح بہتر پائیگی کیونکہ چھٹی بھی ہوگی اور شریعت کے مطابق تیسرے دن تک قربانی جائز ہے۔

میں اس مزیدار بقر عید کیلئے خود کو تیار کر رہا تھا کہ ڈلس Dalls سے نسیم صاحب کو مدعو کیا گیا کہ وہ ان کے یہاں خطبہ دیں۔

اس دعوت میں نسیم صاحب نے مجھے بھی شریک کر لیا۔ ہوسٹن سے ڈلس بذریعہ ہوائی جہاز کوئی چالیس منٹ کا سفر ہے امریکہ میں جہاز بس سے سستا ہے ایئر پورٹ فون کر کے دو سیٹیں بک کر لی گئیں اور مقررہ وقت پر رات کے نو بجے ہم لوگ ایئر پورٹ پہنچے۔ کاؤنٹر سے پچیس ڈالر

والے دو ٹکٹ لے کر ہم لوگ جہاز پر سوار ہو گئے، یہ چھوٹا سا کوئی Domestic جہاز تھا۔ نیگرو لڑکیاں ایئر ہوسٹس کا کام انجام دینے کی کوشش کر رہی تھیں کئی ہچکولے اور جھٹکے کھاتا ہوا جہاز فضا میں تیرنے لگا۔ باہر گہرا اندھیرا تھا ٹھنڈے مشروبات لینے کے بعد ابھی ہم حفاظتی بیلٹ کھولنے اور اونچی اڑان کی دعا پڑھنے کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ اعلان ہوا کہ فوراً اپنی پٹیاں کس لیں اوپر موسم کا مزاج بدل رہا ہے۔ کھڑکی کے باہر گہرے اندھیرے میں بھی بجلی چمکتی نظر آنے لگی۔ پتہ چلا کہ باہر زبردست بارش ہو رہی ہے اور پھر چند ہی منٹ گذرے تھے کہ جہاز جھٹکا کھانے لگا۔ جہاز کی مشین ہی ایسی ہوتی ہے کہ جہاز جتنا چھوٹا ہوگا جھٹکا اتنے ہی زوردار لگے گا جتنے لوگ سو چکے تھے ہڑبڑا کر جاگ پڑے۔ سب حواس باختہ اور چہروں سے پریشانی عیاں تھی میرے ساتھ کی سیٹ پر نسیم صاحب بیٹھے تھے۔ ان کی طبیعت خراب ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کو متلی شروع ہو گئی۔ یہ سلسلہ دس منٹ تک چلتا رہا میری حالت بھی غیر تھی کوشش کے باوجود دعا زبان پر نہیں آرہی تھی۔ میں نے کیا کیا پڑھا کچھ یاد نہیں۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ متلی وغیرہ نہیں ہوئی تھی ہوتی بھی کیسے، بچپن سے کلکتہ کی بسوں اور ٹراموں میں اتنے دھکے کھائے ہیں کہ اب جھٹکا بس کا ہو یا جہاز کا سب برابر ہے بقول غالبؔ :

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

ڈلس ہوائی اڈے پر جناب ارشاد الحق اور چند ساتھی خوش آمدید کہنے کے لئے موجود تھے باہر نکلتے ہی شدید سردی کا احساس ہوا، ہوسٹن چونکہ گرم جگہ ہے اس لئے ہم ویسا ہی لباس پہن کر آئے تھے مگر یہاں کی سردی نے ہمیں بید لرزاں کی طرح کانپنے پر مجبور کر دیا۔ بحر حال فوراً ارشاد صاحب کی کار میں پناہ لی جس میں گرم ہیٹر لگا ہوا تھا۔ اس سے جان میں جان آئی نسیم صاحب نے بھائی ارشاد اور دیگر ساتھیوں سے میرا تعارف کرایا اور بہت جلد سب گھل مل گئے۔ ہم لوگوں کا قیام ارشاد صاحب کے یہاں تھا۔

دوسری صبح ہلکی پھلکی پھوار پڑ رہی تھی اور سردی یخ بستہ کر دینے والی تھی موسم کی خرابی کی وجہ سے نماز عید الاضحیٰ کا انتظام ایک ہوٹل راما دا ان Ramada inn میں کیا گیا۔ ہم لوگ صبح آٹھ بجے تیار ہو کر نکل پڑے کافی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ہوٹل کے ایک کشادہ ہال میں جماعت کھڑی ہوئی۔ تقریباً بارہ سو افراد جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے جمع ہوئے۔ جگہ کی تنگی کی وجہ سے دو خطبے ہوئے۔ زیادہ تر لوگ پاکستانی اور ہندستانی و بنگلہ دیشی، ایرانی، عربی، مصری، افریقی اور امریکی نومسلم تھے۔ بڑی شاندار نماز ہوئی۔ نسیم صاحب نے امامت کے فرائض انجام دیئے۔ اپنی تقریر میں انہوں نے قربانی کے مسئلہ اور سنت ابراہیمی پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ "عید قرباں کا مطلب صرف کسی جانور کی قربانی نہیں بلکہ اس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی ایک عزیز شئے کو اللہ کی رضا کے لئے قربان کیا۔ آیئے آج ہم ایک وعدہ کریں کہ آج ہم اپنی ایک عزیز شے یعنی اپنے اندر کی ایک بری عادت جسے ترک کرنا بہت مشکل ہو اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کیلئے اس کی راہ میں قربان کر دیں ہمیں یقین کامل ہے کہ خدا وند کریم ہماری اس چھوٹی سی قربانی کو ضرور قبول کرے گا آمین!

نماز اور خطبے سے فارغ ہو کر ہم لوگ ملتے ملاتے جناب سلیمان کے گھر پہنچے۔ ایک پر تکلف ناشتہ پھر سوئیوں وغیرہ کے بعد چند نوجوانوں کے ذمہ کام سونپا گیا۔ پتہ چلا کہ یہاں پورے امریکہ میں گھر پر گائے بکرا تو درکنار مرغی بھی ذبح نہیں کر سکتے۔ یہ قانوناً جرم ہے۔ اس لئے ذبح کے سلسلے میں لوگوں کو شہر سے تقریباً بارہ کیلومیٹر دور ایک فارم ہاؤس جانا پڑتا ہے جہاں گائے اور دیگر جانور ٹھنڈے گھر میں رکھے جاتے ہیں۔ بھائی عمران سلیمان کی قیادت میں کچھ لوگ قربانی کے لئے جا رہے تھے۔ مجھ سے کہا گیا تو میں بھی تیار ہو گیا کہ دیکھوں امریکہ میں گائے ذبح کس طرح کرتے ہیں۔ کار سے ہم چار دیگر جوانوں کے ساتھ کنٹری فارم ہاؤس پہنچے۔ معلوم ہوا کہ یہاں گائے پہلے ہی بک کر لی جاتی ہے اور پھر مقررہ دن آ کر آپ کو صرف ذبیحہ کرنا ہوتا ہے۔ یعنی چھری پھیر دی باقی کام یہاں کے کارندے سنبھال لیتے ہیں۔ امریکہ میں شاید ہی کوئی کام ہو جو عورت نہ

کرتی ہو۔فارم ہاؤس کے صدر دروازے پر ہی ایک محترمہ نے پوچھ تاچھ کی۔ پھر ہمیں اندر لے جایا گیا ایک بہت ہی اسمارٹ اور کسرتی جسم والا نوجوان جس کے کانوں میں Walkman ٹیپ کا ہیڈ فون لگا ہوا تھا بغل میں ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈ جھول رہا تھا۔اور موسیقی کے تال پر وہ منہ میں چیونگم چبا رہا تھا ہم لوگوں کے پاس آیا اور کہا کہ سب تیار ہے آیئے قربانی کیجئے۔میں نے فوراً کیمرہ سنبھالا اور اس ہیرو نما قصاب کا انٹرویو لینے لگا کہ بھئی صاحب! کیا یہ آپ کا خاندانی پیشہ ہے میرے احمقانہ سوال پر پہلے وہ سہما پھر کہنے لگا۔امریکہ میں جب خاندان کا تصور ہی نہیں تو پھر خاندانی پیشہ کیا؟ یہ میں نے اپنی مرضی سے منتخب کیا ہے کیونکہ اس کے لئے مجھے اٹھارہ ڈالر فی گھنٹہ مل جاتے ہیں یعنی ڈیڑھ سو روپیہ فی گھنٹہ۔اب میری سمجھ میں آیا کہ جناب گوشت کاٹتے وقت میوزک سننا پسند کیوں کرتے ہیں اور کیوں ہمارے یہاں کے قصاب میوزک کی جگہ گالی دینا اور سننا پسند کرتے ہیں ۔فرق صرف ڈیڑھ سو روپیہ گھنٹہ اور مہینہ کا ہے۔خیر ایک بڑے سے ہال میں چھوٹے قد کی آسٹریلین گائے جس کا وزن پانچ سو پاؤنڈ تھا لائی گئی اور اسے ایک بہت ہی تنگ پنجرے میں لا کھڑا کیا گیا۔ایک صاحب ہاتھ میں ایئر گن لئے داخل ہوئے اور گائے کی پیشانی کا نشانہ لے کر لبلبی دبا دی۔دوسرے ہی لمحے گائے بیہوش ہو کر زمین پر ڈھیر ہو چکی تھی۔بڑی پھرتی سے پنجرہ کھولا گیا اور گائے کے پاؤں کو ایک زنجیر میں ہک کے ذریعہ پھنسا دیا گیا اور ایک بٹن دبا دیا گیا،منوں وزنی گائے بڑی آسانی سے چھت سے لٹک رہی تھی۔اب عمران صاحب کے ہاتھوں میں چھری دی گئی اور ایک بڑا سا اگلدان نما برتن جانور کے نیچے رکھا گیا اور اب لٹکتی ہوئی بیہوش گائے کی گردن پر چھری چل رہی تھی۔۔یہ سب اتنی تیزی سے ہو رہا تھا کہ کچھ دیر میری سمجھ میں نہ آیا۔ذبح کے بعد ہم لوگ کنارے ہٹ گئے اور صرف تیس منٹ میں مشین اور بجلی کے آرے سے گائے کا چمڑا نکالنے سے لے کر ٹکڑے کرنے تک میں لگے اس طرح ڈیڑھ گھنٹے میں تین گائے قربان ہو کر تیار ہو چکی تھیں۔ہم لوگ اسی رات ہوسٹن آ گئے۔ہوسٹن میں قربانی اگلے دن تھی۔یہاں زیادہ تر بکرے کی قربانی ہوئی اور اسلامک سینٹر میں ایک بڑے سے ڈیپ فریزر کا انتظام تھا۔کسے فرصت ہے کہ گوشت بانٹے سبھوں نے قربانی کا ایک حصہ سینٹر میں رکھوا دیا تھا۔دعوت عام تھی جسے ضرورت تھی وہ اپنے ہاتھ سے اپنی ضرورت کے مطابق گوشت لے جا رہا تھا اس بمپر آفر کا بھرپور فائدہ ہوسٹن میں مقیم ایرانی،سیاہ فام اور ہندستانی مسلمان طالب علموں نے اٹھایا بس ''جو بڑھ کے ہاتھ میں لے لے یہ دل گردہ اسی کے ہیں'' امریکہ کی یہ دلچسپ مگر عجیب وغریب عید قرباں میں شاید ہی کبھی بھول پاؤں۔



کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

کلکتے کی ہنگامی زندگی میں نیویارک کی یاد میں سرد یا گرم آہیں بھرنا ممکن نہ سہی مگر نیویارک کی حشر سامانیوں میں کلکتہ کی یاد بس، اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے''۔اور یاد کی وجہ کوئی توبہ شکن نہیں بلکہ گندگی ہے۔آپ کو حیرت ہوگی کہ نیویارک شہر اپنی گندگی کی وجہ سے امریکنوں کے لئے دردسر بن چکا ہے۔اس شہر کی گندگی کا ایک کلاس ہے۔اپنا ایک معیار ہے۔اس کے برعکس کلکتے کی غلاظت کا کوئی معیار نہیں۔خود کلکتہ ابھی کسی خانے میں فٹ نہیں بیٹھا ہے۔یہاں ہر طرح کا پسندیدہ ناپسندیدہ کوڑا کرکٹ سرِ راہ مل جائے گا بلکہ پبلک کے سر پر بھی مل سکتا ہے مگر نیویارک میں اس انداز نرالا ہے۔سرِ راہ یا فٹ پاتھ پر گندگی برائے نام ہے۔سڑک صاف ستھری • ہماری کہانیوں والی شیشے کی ہے) زرق برق لباس والے خوش رنگ چہرے رواں دواں ہیں۔جاپانی کھلونوں کی طرح چھوٹی بڑی گاڑیاں ان راستوں پر پھسل رہی ہیں۔فلک بوس عمارتیں سینہ تانے کھڑی ہیں۔ہوٹل، بار اور کیفوں میں زندگی بیدار ہے۔منظروں کی لمبی قطار سے آنکھیں سیراب ہوتے ہی کچھ اور دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔سڑک کی ہماہمی سے ہٹ کر میں جیسے ہی منہاٹن (Manhattan) کے علاقے کی زمین دوز ریل کے لئے نیچے اترا سارا نقشہ الٹا تھا۔خالی سگریٹ کے پیکٹ سے لے کر بیئر کے کین تک قدم بوسی کو تیار تھے۔پلیٹ فارم کی دیواروں پر آڑی ترچھی لکیروں سے اتنے لوگوں نے اتنا کچھ لکھا تھا کہ اب دیوار کا اصل روغن یہی لکیریں تھیں۔کوئی بھی سائن بورڈ اپنی اصلی حالت میں نہیں تھا اور ہر تصویر پر طبع آزمائی کی گئی تھی۔یہاں تک کہ سیڑھیاں بھی قوس و قزح کے بہار دکھا رہی تھیں۔کچھ ہی دیر میں ایک ٹیوب ریل سنسناتی ہوئی آئی۔ماشاء اللہ یہاں کی ریل بھی رنگ برنگی تھی۔اندر اور باہر ان لکیروں سے کچھ لکھا گیا تھا۔لکھنے والا شاید خود بھی نہ پڑھ سکے کہ کیا لکھا ہے۔میں کچھ دیر زمین دوز پلیٹ فارم پر رکنا چاہ رہا تھا۔شامتِ اعمال کہ وہاں کے باتھ روم میں جانا چاہا مگر ہمت نہ ہوئی۔وہ تعفن کہ معاذ اللہ۔ہم سمجھتے تھے کہ ہمارا سودیشی باتھ روم ہی دنیا کا واحد باتھ روم ہوگا مگر جب دنیا دیکھی تو پتہ چلا کہ ہم کیا اور ہمارا باتھ روم کیا۔بڑے بڑے پڑے ہیں اور بد سے بدترین باتھ روم بلکہ دیگر روم بھی اس شہر نیویارک میں دستیاب ہیں۔

میں پلیٹ فارم پر بے مقصد ادھر ادھر گھوم رہا تھا اور ساتھ ہی ان آرٹسٹک لکیروں کو دیکھ رہا تھا۔بڑی کوشش کے باوجود بھی کچھ پلے نہیں پڑا۔میں سوچ رہا تھا کہ بنانے والے نے شاید غالبؔ کے شعر میں ذرا سی ترمیم کے بموجب کام کیا ہے کہ :

لکھ رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

مجھے منہمک دیکھ کر ایک حبشی نوجوان میرے قریب کھسک آیا اور نہایت راز دارانہ انداز میں پوچھا ''آپ کو گرافیٹی آرٹ کیسا لگا؟''میں ہڑبڑا گیا اور خود کو سنبھالتے مسکراتے ہوئے کہا: آرٹ ہر معنی میں آرٹ ہوتا ہے مگر یہ گرافیٹی کیا ہے۔اس نے دوبارہ مشینی مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ ان رنگ برنگی، آڑی ترچھی اور ہر قید و بند سے آزاد لکیروں کو گرافیٹی (Graffiti) کہتے ہیں۔آج سے تقریباً دس سال قبل نیویارک کے بیزار جوانوں کے گروپ نے جس میں اسی فیصد کالے امریکی شامل ہیں اس کا آغاز کیا تھا اور یہ ایک قسم کا قید و بند یا (Establishment) کے خلاف احتجاج ہے۔ویسے نعرہ بازی اور جلوسوں میں کلکتہ کسی طرح پیچھے نہیں مگر نعرہ بازی (Sologan) کا یہ انداز بالکل انوکھا ہے۔عام شہری اس سے پریشان ہیں اور اسے دماغی خلل کہتے ہیں۔اس خاموش احتجاج سے نیویارک ٹرانزٹ اتھارٹی بھی بدظن اور نالاں ہے۔معلوم ہوا کہ پانچ لاکھ ڈالر سالانہ دیواروں، سیڑھیوں اور ریل کے اندر اور باہر کی صفائی پر انتظامیہ خرچ کرتی ہے۔حکومت کی طرف سے یہ پابندی عائد کردی گئی ہے کہ ۱۸ سال سے کم

عمر کے بچوں کو کسی طرح کا Spray رنگ نہیں بیچا جائے گا کیونکہ گرافیٹی آرٹ اب اسکول کی دیواروں تک پہنچ گیا ہے مگر گرافیٹی ایک جونک کی طرح نیویارک کی زمین دوز ریلوں اور دیواروں سے چمٹا ہوا ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے اجنبی رہنما سے پوچھا کہ اگر یہ گرافیٹی آرٹ ہے تو اسے آپ اسٹوڈیو یا پھر آرٹ گیلری میں پناہ کیوں نہیں دیتے؟ اس نے آخری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا کہ ہم اس کی وسعتوں کو محدود کرنا نہیں چاہتے اور آرٹ گیلری میں لوگوں کا ہجوم اسے دیکھنے شاید ہی جائے۔ اسکے برعکس زمین دوز کے لاکھوں مسافر اسے صبح شام دیکھتے ہیں اور عام شہری بھی اسے کچھ حد تک آرٹ تسلیم کرنے لگے ہیں اور پھر جو مزا لوگوں کے اژدہام میں ساٹھ ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتی ہوئی ریل کے بدن پر بنے گرافیٹی آرٹ کا ہے وہ مزا آرٹ گیلری میں کہاں۔ گو کہ یہ حرکت قانوناً جرم ہے مگر اب کچھ گرافیٹی آرٹ کی شہرت اور مقبولیت بڑھ رہی ہے۔ پتہ چلا کہ نیویارک کے فیشن ایبل سوہو آرٹ گیلری میں ان دنوں چند خاص نمونے گرافیٹی آرٹ کے نمائش میں لگے ہیں۔

دوسرے دن پہلی فرصت میں سوہو آرٹ گیلری گیا۔ وہاں فیڈرک نامی ایک آرٹسٹ سے ملاقات ہوئی۔ مجھے اس نرالے آرٹ کا قدردان سمجھ کر وہ بہت خوش ہوا اور بڑی سنجیدگی سے مجھے گرافیٹی کے رموز سے آگاہ کیا۔ اس نے بتایا کہ ہمیں اعتراف ہے کہ کچھ ناتجربہ کار لڑکے اس معاملے میں شدت پسندی اختیار کئے ہوئے ہیں مگر اب آرٹ کی دنیا گرافیٹی کے فن کو تسلیم کر رہی ہے ہوسکتا ہے کہ کچھ شہری زمین دوز ریل کی دیواروں، نقشوں اور پلیٹ فارموں پر اس کی نمائش سے ناخوش ہوں لیکن ہمیں اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہئے کہ کچھ شریف شہری زمین دوز ریل کے اندر اور باہر دیواروں پر عریاں اشتہار بھی پسند نہیں کرتے۔ خیر وہ دن دور نہیں جب اس فن کو اس کا مناسب مقام حاصل ہوگا۔ اب تو ہماری کاوش کا صلہ پانچ ہزار ڈالر تک جا رہا ہے اور اس کے قدردان بڑی بڑی رقمیں دے کر اسے حاصل کر رہے ہیں۔ امریکہ میں خطبیوں کی کمی نہیں اور خاص کر نیویارک کے یانکی (Yankees) کا جنون اپنی انتہا کو ہوتا ہے۔ نیویارک کی سب وے کی گندگی اور جرائم کے قصے خوب ہیں۔ سیاحوں کے لئے ٹی شرٹ پر ایک مزے دار جملہ لکھا دیکھا۔

I RODE A NEWYORK SUBWAY AND SERVIVED

نیویارک کی گندگی کی ایک اور وجہ کوڑا کرکٹ، شہر کی غلاظت، فضلہ اور ڈیزل کی آلودگی ہے۔ شہر کی بڑی اور کشادہ شاہراہوں پر گو کوڑے کا انبار نہیں مگر پورے شہر میں مختلف مقامات پر کسی نہ کسی صورت میں گندگی موجود ہے۔ اس کی ایک وجہ گھنی آبادی بھی ہے۔ امریکہ اور خاص کر نیویارک اور کیلی فورنیا جو کچھ کوڑے کے طور پر پھینک دیتے ہیں اتنا دوسرے ملک والے پیدا نہیں کرتے۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ صرف نیویارک کے شہری روزانہ سات کروڑ پاؤنڈ کی بے مصرف اشیاء کوڑا کرکٹ کی شکل میں پھینک دیتے ہیں یعنی ہر شہری کوئی دس پاؤنڈ کوڑا اپنے گھر سے روزانہ نکالتا ہے۔ جدید طرز کی پیکنگ Packing نے بھی کافی پریشان کر رکھا ہے۔ اس میں کاغذ کا بے جا استعمال اور روزانہ زندگی میں کاغذ کی مصنوعات جیسے پلیٹ، کپ، گلاس، تولیہ اور ٹائلٹ پیپر کو ایک بار استعمال کیا اور پھینک دیا۔ ساتھ ہی ٹھنڈی مشروبات کے کین Can ہیں۔ پچاس فیصد غلاظت ان کین کی وجہ سے ہے۔ اب کسے فرصت کہ بوتل پی کر واپس کرے، کین میں ہر قسم کے مشروبات دستیاب ہیں، پیا اور پھینکا، ایک اندازے کے مطابق کوئی پندرہ کروڑ کین Can سالانہ استعمال کے بعد کوڑا خانے کی زینت بنتے ہیں۔ بے مصرف اشیاء اور کوڑا کرکٹ ہی نہیں بلکہ پرانی اور بے کار گاڑیاں بھی اتنی ہوگئی ہیں کہ ان کے کار ڈمپ Car Dumps بنائے گئے ہیں۔

نیویارک ہو یا امریکہ کا کوئی بھی شہر اس مصیبت کی جڑ ہے، مغربی سماج کا اصراف ساتھ ہی کسی بھی بے مصرف اشیاء کے دوبارہ استعمال نہ کرنے کا رجحان اگر Re-Cycle کا سسٹم ہوتا تو یہ غلاظت نہ ہوتی بلکہ ملک کی معاشیات کو فائدہ ہی پہنچتا۔ Re-Cycle کی بات پر مجھے کلکتے کے خالی ڈبہ خالی بوتل والے یاد آگئے۔ ارے صاحب ہماری سوسائٹی کچھ سوچ سمجھ کر ہی پیشہ اختیار کرتی ہے۔ اب تو بات جوتے چپل تک پہنچ گئی ہے بلکہ ہم کہتے ہیں کہ پورا سماج اب سکنڈ ہینڈ ہو چکا ہے۔ جو چیز پہنچتی ہے پتہ نہیں پہلے کتنے لوگوں کو خوش کر چکی ہوگی مگر اس دوراندیشی اور سوجھ بوجھ کے باوجود پتہ نہیں کیوں کوڑا اب تک ہمارے گھروں کے سامنے زلفِ پریشاں کی طرح بکھرا رہتا ہے۔

•••

سحر کی سرائے اور ادبی چپقلش

امریکہ کے سفر میں میرا جنکشن یا خاص پڑاؤ نیویارک تھا۔ بقول شخصے "یہ شہر اس طوائف کی طرح ہے جس کے قریب رہو تو گھن آتی ہے مگر دور جاؤ تو جی اداس ہو جاتا ہے۔"

میں بھی اس بے وفا شہر سے جتنا پریشان تھا۔ یہاں کے دوستوں سے اتنا ہی خوش اور ممنون۔ میں جہاں جاتا گھوم پھر کر نیویارک آنے کے لئے مجبور تھا۔ میرے بہت سے ساتھی یہاں مقیم ہیں۔ کچھ علی گڑھ کے زمانے کے منچلے کچھ لکھنؤ کے باوقار اور کچھ بمبئی کے گلفام نما کچھ کلکتے کے نوٹنکی والے بنگالی بابو اس کے علاوہ پاکستان کے کچھ فن کار ساتھی۔ اس طویل فہرست میں سب سے نمایاں نام ہے افتخار سحرؔ فتح پوری۔

کسی زمانے میں یہ بانکا سجیلا شاعر بمبئی کی چاندی نگری میں اپنی پرسنالٹی، فن اور وجاہت کو کیش کرانے کے چکر میں سرگرداں تھا۔ مگر کبیر بیدی کی طرح سحر کی بھی وہ صبح کبھی نہ آئی جس کا انتظار تھا۔ وہ تو کہئے امیتابھ کی قسمت ساتھ دے گئی اور سحر کی فلم "پاگل دنیا" ڈبے میں بند رہی ورنہ..........

سحرؔ نہ صرف ایک خوش گلو اور تازہ دم شاعر ہے بلکہ شمالی امریکہ کی ادبی نشستوں، مشاعروں اور راگ ورنگ کی جان ہے۔ میں نے سحرؔ کے بنگلہ کا نام "سحر کی سرائے" رکھ دیا تھا۔ کوئی شاعر، غیر شاعر، سیاح، رشتہ دار نیویارک آئے اس کی دیکھ بھال اور قیام وطعام کا سحر اس طرح اہتمام کرتا ہے جس طرح مجاور عرس کا اہتمام واہتمام کرتے ہیں۔ سحرؔ کی فیاضی سے اس کے گھر والے نالاں تھے اور جب دیکھو مہا بھارت کی ریہرسل ہو رہی ہے۔

مجھے نہ صرف سحرؔ کی سرائے میں ٹھہرنے کا شرف حاصل ہوا بلکہ نیویارک کے اردو سرکل سے متعارف بھی اسی نے کرایا، میں کسی مشاعرے کی تفصیل میں نہیں جا رہا ہوں کیونکہ اس سے زیادہ لطف ہمیں اور دیگر مہمان شعراء کو مشاعرے کے بعد کی محفلوں سے آتا ہے۔ ایک اور مزے کی بات یہ تھی کہ سحر غریب مہمانوں کے لئے کھانا بھی خود ہی تیار کرتا اور خوب کرتا۔ کچھ لوگوں کو شک تھا کہ یار بمبئی میں کسی بھٹیار خانے میں پارٹ ٹائم باورچی تو نہیں تھا۔ شاعروں، صحافیوں، گویوں اور دوستوں کو ایئرپورٹ سے پک اپ کرنے سے لے کر شاپنگ اور الوداع تک سحر کی ذمہ داری اور دردِ سر تھا۔ بہت سے معاملوں میں مہمانوں کا ردعمل کچھ کا کچھ ہو جاتا مگر سحر کا بدل کوئی نہ تھا۔

نیویارک کی مشینی زندگی میں کس کو اتنی فرصت ہے کہ ایک دن کی مہمان نوازی اور ایک شب کے مشاعرے سے زیادہ وقت نکالے مگر سحر کے یہاں لوگ ہفتوں بلکہ مہینوں پڑے رہتے ہیں۔ اسے مہمان نوازی کا مالی خولیا ہے۔ ہاتھ تنگ ہو تو کسی سے قرض لے کر خاطر داری ہو رہی ہے۔ میں نے ایسا یار باش اور زندہ دل دوست کم دیکھا ہے۔ احمد فرازؔ کی دل بستگی کا سامان مہیا کرنا ہو، مجروح سلطان پوری اور ان کی بیگم کو شاپنگ کرانی ہو۔ منیر نیازی کو مزید شراب پلانا ہو، بشیر بدرؔ کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہو، اختر الایمان کو ایئرپورٹ چھوڑنا ہو، نو آزمودہ دوستوں کو آزمودہ فلم دکھانی ہو یا پھر چند صوفی اور مولوی صورت مسکین، عمر دراز مگر عزت دار قلم کروں کو فورٹی سیکنڈ اسٹریٹ گھمانا ہو ــــــ ہر غم کا علاج سحر فتح پوری!

مگر اس غم گسار شاعر کی مہمان نوازی اور عظمت سورج کی روشنی میں بھلی لگتی ہے۔ شام کے جھٹپٹے میں ساری عظمت اس عظیم شیشے میں ڈوب جاتی ہے۔ جس سے ابھرنا اس کے بس میں نہیں۔

اردو کی آبیاری اور اپنے کلچر کی پرورش کچھ اور ساتھی بڑے جوش و خروش سے کرتے نظر آئے۔ ان میں ایک نام ظفر زیدی کا ہے۔ لکھنؤ کے اس پُر وقار اور خوش اخلاق شاعر سے ہر ایک کو محبت سے پیش آتے دیکھا۔ ظفر اپنی ذات میں ایک انجمن ہے۔ ایک سچا فنکار، افسانہ نگار اور گیت کار ــــ مجھے کیا ہر ذی ہوش اردو دوست کو ظفر سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ ایک اور قابلِ ذکر نام حمیرا رحمان کا ہے۔ شمالی امریکہ میں نئی نسل کے نمائندہ قلم کاروں میں حمیرا کا نام سرفہرست رکھا جاسکتا ہے۔ حمیرا کی مہمان نوازی بھی مشہور ہے۔ ان کے یہاں کی نشستیں اور دعوتیں مجھے یاد رہیں گی۔

عادل رشید مرحوم کے ناول پڑھنے کا شرف مجھے حاصل نہ ہوسکا مگر سحر کی بدولت ان کے قابل بیٹے جاوید عادل رشید سے ملاقات خوب رہی۔ جاوید ان دنوں نثری نظموں پر طبع آزمائی کر رہے ہیں۔

ایک نشست میں سحر نے ایک خوش لباس صاحب سے ملوایا۔ (بچپن میں پڑھے ''مرزا ظاہر دار بیگ'' کے کردار کو زندہ اپنے سامنے دیکھا) مگر مامون ایمنؔ وضع داریوں سمیت بڑے خلوص سے ملے۔ سبھوں کے ایمن صاحب اور میرے مامون بھائی کہنہ مشق شاعر اور پرانی قدروں کے چلتے پھرتے میوزیم نکلے۔

نیویارک میں اردو والوں نے کئی انجمنیں بنا رکھی ہیں۔ جتنا کام ہو رہا ہے اتنی چپقلش۔ کوئی بزم بنی کرسی کا جھگڑا ہوا تو کوئی اور ادبی سنگم وجود میں آ گیا۔ یہاں ادب کے نام پر بے ادبی ہونے لگی تو ایک اور حلقہ سامنے آ گیا۔ تمام نا اتفاقیوں کے باوجود مشاعرے بڑے زور وشور سے برپا ہوتے ہیں۔ اپنے اپنے گروپ اور لابی کے قلم کاروں کو امپورٹ کیا جاتا ہے اور من پسند فنکاروں کو انعام واکرام سے نوازا جاتا ہے ــــ میرے سامنے بھی خوب ڈرامے ہوئے۔ مجھے کوفت کے بجائے مزہ آتا کہ اردو کی قسمت ہی ایسی ہے۔

نوک جھونک صرف مشاعرے تک نہیں بلکہ ریڈیو اور ٹی وی پروگراموں اور اسٹیج شو تک  یار سے چھیڑ چلی اسدؔ'' والا معاملہ ہے۔ نیویارک کے ہندی والے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ بھی کوی سمیلن منعقد کرتے ہیں اور کاکا ہاتھرسی اور ہلڑ مرادآبادی کو بلانے سے نہیں چوکتے۔ اردو اور ہندی کے بے شمار شعراء اور فنکار نیویارک میں ملے۔ ایک مغل شاعر پرنس مظفر شکوہ بھی ان دنوں یہیں مقیم ہیں۔ ان سے ملاقات حمیرا کے یہاں ہوئی۔ جتنے اچھے شاعر اس سے کئی گنا اچھے انسان۔ اگر کبھی موقع ملا تو مظفر شکوہ صاحب سے اپنے کسی تاریخی ڈرامے یا تمثیل میں بہادر شاہ ظفر کا رول ضرور کراؤں گا۔ ڈرامے کی بات پر یاد آیا کہ سحر کی کوششوں اور بھارتیہ ودیہ بھون کے اسپانسر شپ پر میرا ڈرامہ ''کینسر'' نیویارک کے یک بابی ڈرامہ فیسٹیول میں اسٹیج کیا گیا اور ایک ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ایک زمانہ تھا جب ''ادب برائے ادب'' یا ''ادب برائے زندگی'' کی بحثیں ہوتی تھیں مگر اب اردو والوں نے کافی ترقی کر لی ہے۔ مجھے تو ہر جگہ ادب ''ادب برائے کرسی'' نظر آیا!!!

●●●

تھوڑی فاسقی کچھ عاشقی

آجکل پورے امریکہ میں ڈائٹنگ اور ڈیٹنگ کا دور دورہ ہے جس ٹی وی شو میں دیکھو جسمانی ورزش اور یوگا کے سبق کی بھرمار ہے جسے دیکھو بھاگا جا رہا ہے، جاگنگ کر رہا ہے، ہر کوئی Slim ہونے کے لئے پاگل ہوا جا رہا ہے۔ یہ سب اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ پُرکشش یا سیکسی بنانے کا چکر ہے۔اس کے ساتھ ڈیٹنگ کی وبا عام ہے۔لڑکا ہو یا لڑکی ڈیٹنگ ان کی عزت کا سوال بن چکی ہے۔ یہ امریکی لائف اسٹائل کی سوشل ایجاد ہے۔ پہلے زمانے میں مغرب میں بھی شادی والدین کی مرضی سے ہوتی تھی۔لگ بھگ ۱۹۶۰ء سے والدین خود براڈ مائنڈڈ ہوگئے تو پھر ان کی اولادوں نے اپنے لائف پارٹنر چننے کے لئے ڈیٹنگ کا سہارا لے لیا ہے۔اگر کوئی لڑکی ڈیٹنگ سے گھبرائے تو اسے شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔یا کوئی لڑکا ڈیٹنگ نہ کرے تو اسے ''گیے'' سمجھا جاتا ہے۔

عورتوں نے مردوں کے مساوی حقوق اور آزادی حاصل کرنے میں کیا کچھ نہیں کیا۔خود کماتی ہیں، انہیں روکے تو کون :

حسن خود بیتاب ہے جلوہ دکھانے کے لئے

اب ڈیٹنگ محض تفریح کا وسیلہ ہے۔ایک دوسرے کو سمجھنے کا بہانہ جب اسی طرح زندگی گزر سکتی ہے تو شادی کون کرے اور پھر شادی بھی تو عورتوں کا معاشی سہارا نہ رہی۔اب تو بات کمیون تک پہنچ رہی ہے جو ایک ٹولی یا گروہ میں ایک ساتھ زندگی گزارنے کے طرز کا نام ہے۔اس پر امن جماعت میں ہر کوئی ہر کسی کی ملکیت ہوتا ہے۔اس طرزِ زندگی کو ہمارے یہاں کے جنسی بھگوان رجنیش اور ایسے ہی دوسرے گرو ہوا دے رہے ہیں۔

فلم ہو یا روزمرہ کی زندگی، اب روایتی محبت صرف شیکسپیئر کے ڈراموں میں نظر آتی ہے۔اگر رومان ادب یا عملی زندگی میں ہے تو بھی اتنی بگڑی شکل میں ہے کہ توبہ بھلی۔ایک دور جنسی فلموں کا تھا۔اب ہم جنسی فلموں کا زمانہ ہے۔اب جمہوریت کی چھوٹ بھی تو کوئی چیز ہے آخر! دراصل مغرب والے عورت اور مرد کے ازلی تعلقات سے بیزار ہو چکے ہیں۔اب تو کمپیوٹر سے عورتوں کو حاملہ بھی کیا جانے لگا ہے اور ٹسٹ ٹیوب بے بی بھی مسکرا رہی ہے۔

پچھلے دنوں میں نے ایک فلم دیکھی The Last American Virgin ''امریکہ کی آخری کنواری''،فلم خاصی اچھی تھی مگر اس نے امریکی جوانوں کے خطرناک رجحان اور فری سیکس کی خوب چغلی کی۔آج کل امریکہ کے سوشیالوجسٹ خوب نکتہ چینیاں کر رہے ہیں کہ ''کیا شادی کا رواج ہماری نسل کے ساتھ ختم ہو جائے گا'' مگر یہ بحثیں صرف اخباروں تک محدود ہیں،عملی زندگی میں ہر کوئی آزاد ہے۔جذبات نام کی چیز سرے سے غائب۔تمام جذبوں کو پریکٹیکل کر دیا گیا ہے۔

لفظی نصیحتوں کا زمانہ گیا۔مغرب والے ہر نصیحت کو اب سرعام اخباروں اور کتابوں میں لے آئے ہیں۔خدمت خلق کے لئے ——

اب اگر کسی شریف زادے یا زادی کو محبت کرنا نہیں آتی تو وہ چپ سادھ لے یا ہماری طرح ہجرت کرے۔اس نیک بخت کے لئے How to Express Love ''محبت کا اظہار کیسے کریں'' صرف دس ڈالر میں حاضر ہے۔اس طرح کی ایک سو ایک کتاب دستیاب ہے یعنی ''رومانس کیسے کامیاب ہوگا''۔عورتوں کے لئے آپ کا من پسند گلفام'' یہی نہیں، ان کے ساتھ صحت کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ایک کتاب دیکھی ''ورغلاہٹ او

ریوگا"، یعنی پہلے ورغلائے پھر یوگا کرائے! فحاشی کی سب سے اپ ٹو ڈیٹ ڈکشنری بھی خوب بک رہی ہے —— رومانی سیکس کا سبق بھی اچھا دھندا ہے۔

بے راہ روی نے اب ہزاروں مسئلے کھڑے کر دیئے ہیں۔ جنسی امراض، غیر قانونی اسقاطِ حمل، ناجائز بچے، شراب، منشیات، جوا اور سب سے بڑھ کر اعصابی مریضوں کی بھرمار، ہر کوئی اندر سے ٹوٹا ہوا۔ احساسِ تحفظ کیلئے ڈرا ڈرا۔ نفسیاتی ڈاکٹروں کے رحم و کرم پر زندہ ہے۔

دنیا کی سب سے ترقی یافتہ قوم جب فخریہ اعلان کرتی ہے کہ دنیا کی ساری آسائشیں، دنیا کا سب سے بڑا دریا مسی سپی، دنیا کی سب سے بڑی جھیل گریٹ لیکس، سب سے بڑا آبشار نیاگرا، سب سے وسیع تفریحی مرکز ڈزنی لینڈ، سب سے بڑی سرنگ آئزن ہاور، سب سے بڑا سیرس ٹاور ان کی ملکیت ہے تو وہ وقتی طور پر یہ بھول جاتی ہے کہ دنیا کی سب سے مسکین اور قابلِ رحم قوم بھی امریکی ہے۔

واپسی کے تمام راستے کھلے ہیں مگر اس قوم نے اپنی کشتی جلا دی ہے۔ مغربی سوسائٹی میں سب سے زیادہ بگاڑ یہاں کی پبلسٹی اور ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں نے کیا ہے۔ ٹوتھ پیسٹ سے لے کر ہوائی جہاز تک کے اشتہار میں عورت کی وہ درگت بنائی ہے کہ بس...... ہر جگہ، موڑ پر، اخبار میں، میگزین اور پوسٹر میں نسوانی جسم کے خدوخال کا وہ حشر کیا ہے کہ اللہ اللہ...... فیض جیسے کہنہ مشق بھی کہہ اٹھے : اٹھ ہی جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے

ان تمام شوریدہ سری کے باوجود امریکی ماہرین نفسیات کو اس کا اعتراف ہے کہ قوم پستی کی طرف جا رہی ہے۔ خود قوم کو اس کا احساس ہے اور اب وہ نئے راستوں کی تلاش میں سرگرداں ہے اور خود کو نئے سانچوں میں ڈھال رہی ہے۔ مجھے بھی امید ہے کہ ذہنی کشادگی کو وہ تعمیری کاموں میں لگائیں گے!!!



http://www.kitaabghar.com
urdukutabkhanapk.blogspot.com

ایل-اے: عجب ہے یہ شہر روشنی کا

نیویارک میں خزاں کی حکمرانی تھی مگر سردی بھی دبے پاؤں آ چکی تھی۔ موسم عجیب سا تھا۔ کبھی سردی، کبھی گرمی۔ ساتھ ہی بے موسم کی بارش۔ کانکریٹ کے اس جنگل سے اچانک جی گھبرانے لگا۔ میں اس قفسِ رنگین سے فرار کے بہانے اور ٹھکانے ڈھونڈ رہا تھا کہ خیال آیا کیوں نہ نیر آپی کے یہاں لاس اینجلز چلا جائے۔

مغرب میں اردو کی آبیاری میں نیر جہاں نیر کی غزلیں اور نظمیں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ ہندو پاک، سعودی عرب، ناروے اور پتہ نہیں کہاں کہاں سے اردو دوست اور میری طرح آوارہ گرد بیچاروں کو امریکہ پہنچ کر اگر نیر صاحبہ کی میزبانی نصیب نہ ہوئی تو اس سے بڑا بدقسمت نہیں ——— باہر سے آنے والے مہمان بننے کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں اور مغرب میں مقیم دوست اور عزیز انہیں ٹالنے کا بہانہ! مگر نیر آپی کے یہاں معاملہ الٹا ہے۔ یعنی آ بیل مار مجھے! نیر آپی جو امریکن آپا بلکہ جگت آپا ہیں بہت روایتی لکھنوی طرز کی میزبان ہیں۔ اللہ ان کے ذوق وشوق کو قائم و دائم رکھے کہ پتہ نہیں کس کس کا بھلا ہوتا رہتا ہے۔

میں نے ایل-اے کا فون گھمایا۔ دوسری طرف ایک بہت ہی سریلی آواز نے کانوں میں رس گھول دیا۔ میں نے اپنا حالِ غم سنایا۔ نیر آپی نے مجھے برداشت کرنے کا وعدہ کرلیا۔ میں نے فوراً معلوم کیا کہ سب سے سستی کون سی فلائٹ مل سکتی ہے۔ پتہ چلا People Express والے کچھ کم تین سو ڈالر میں مجھے زیروز بر کردیں گے۔ تین جوڑے ایک بیگ میں ٹھونسا، ایک عدد سودیشی سوٹ کندھے پر ڈالا بغیر سوٹ کے آج کل مشاعروں میں ہوٹنگ ہوجاتی ہے) میں نے لبیک کہا! سیٹ کنفرم ہوجانے کے باوجود پیپل ایکسپریس والوں کی کچھ خاص ہدایتیں تھیں کہ مقررہ وقت سے دو گھنٹہ پہلے چیک اِن کرلو ورنہ بڑھ کر جو لے سیٹ یاں جہاز اسی کا ہے۔

نیویارک سے ایل کا سفر آٹھ گھنٹے کا ہے مگر اسے ہم نے پانچ گھنٹوں میں پورا کیا کیونکہ این وائی اور ایل اے میں تین گھنٹوں کا فرق ہے۔ لوکل ٹائم سے گھڑی ملاتا میں صبح پانچ بجے ایئرپورٹ سے باہر نکلا۔ لینڈ کرتے وقت میں نے جہاز سے نیچے قرمزی اور مرکری روشنیوں کا مچلتا سیلاب دیکھا تھا۔ باہر نکلتے ہی ایک ٹیکسی مل گئی اور میں نے سانتا مانیکا کا پتہ بتایا۔ مجھے فوراً اندازہ ہوا کہ روشنیوں کا یہ شہر صاف ستھرا اور کشادہ ہے۔ یہاں نیویارک کی طرح فلک بوس عمارتوں کی بھرمار نہ تھی نہ ہی لندن کی پیرانہ سالی کا جمود مگر ایک چیز تھی جو لندن کی یاد دلا رہی تھی وہ تھی Fog یعنی دھند۔ ایل اے تمام کشادگی کے باوجود ایک صنعتی شہر ہے اور علی الصبح فیکٹریوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں نے دھند کو دبیز کر دیا تھا۔ ایل اے والوں نے اس دھند کا نام Smog رکھ لیا تھا جو Smoke اور Fog کا مخفف ہے۔ امریکی نئی اصطلاحات نکالنے میں ماہر ہیں۔ جیسے لاس اینجلز کا ایل اے، نیویارک کا این وائی، واشنگٹن ڈی سی کو صرف ڈی سی، خود میرے وجود کو نیویارک کے دوستوں نے جے ڈی تک محدود کردیا تھا۔

نیر آپی جتنے تپاک سے ملیں اسی قدر خلوص سے ان کی بچیاں عظمیٰ، سیما اور طاہرہ ملیں۔ گھر کا ماحول مشرقی تھا۔ خاص کر نیر آپی کے کمرے نے اچھی خاصی لائبریری کی شکل اختیار کرلی تھی۔ اردو کتابوں کا ایک قیمتی ذخیرہ ان کے ذوق کی غمازی کررہا تھا۔

سنیچر کی شب تھی۔ ویک اینڈ کی وجہ سے لوگ فرصت میں تھے۔ رات کے پرتکلف ڈنر کے بعد ایک نشست کا اہتمام کیا گیا۔ نیر آپی نے

مجھ سے ملوانے کے لئے کچھ دوستوں کو مدعو کیا تھا مگر آئے صرف احمد جعفری۔ پہلی ملاقات میں احمد جعفری مجھے بہت اچھے لگے۔ خوبرو اور نوجوان مزاحیہ شاعر۔ پاکستان کے مشہور شاعر سید جعفری کے صاحب زادے نکلے مگر احمد کا اپنا اسٹائل ہے۔ ان کے مزاحیہ اشعار اور نظمیں امریکہ کے ماحول پر طنز اور یہاں کی روزمرہ کی زندگی کا آئینہ ہیں۔ جہاں تک مجھے پتہ ہے احمد جعفری اپنے طرز کے واحد شاعر نہ صرف ایل اے بلکہ پورے امریکہ میں ہیں۔ کافی دیر تک احمد کو ہم لوگ سنتے رہے۔ مجھے احمد کے پڑھنے کا مخصوص انداز یعنی آدھا تحت اور آدھا ترنم بھی بہت اچھا لگا۔ ان کے بعد ہم نیر آپی کی نظمیں سنتے رہے۔ ان کے کلام میں گہرائی اور آواز میں درد تھا۔ اس کے بعد مجھ سے میری آوارگی اور سفر کے دوران ہونے والی تجرباتی نظمیں سنی گئیں۔ چائے کا دور چلا پھر نغموں کی فرمائشیں شروع ہوئیں۔ احمد نہ صرف اچھے شاعر، مخلص انسان بلکہ اچھے گلوکار بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی پسند کے نغمے سنائے جن میں ''جانے کہاں گئے وہ دن'' کو مکیش سے زیادہ گمبھیر ہوکر سنایا۔ اس کے بعد سہگل، رفیع اور لتا کے پرانے نغمے بہہ نکلے۔ مغرب میں جب کبھی اور جس کسی محفل میں مل بیٹھنے کا اتفاق ہوا کچھ ایسا ہی ماحول ملا۔ وطن اور گھر سے دور رہ کر دیسی لوگ اسی طرح اپنے پکوان اور کلچر کا آموختہ دہراتے رہتے ہیں ـــــ افسوس ان لوگوں پر ہوا جو اپنا سبق بھول گئے۔

دوسرے دن ظفر عباس بڑے تپاک سے ملے۔ فارغ بخاری صاحب سے لندن میں ملاقات نہ ہونے کا افسوس جاتا رہا کہ ان کے قابل بیٹے ظفر بھائی سے آج ملاقات ہوگئی تھی۔ ظفر بھائی بھی ایل اے کے چند اچھے شاعروں میں سے ایک ہیں۔ ظفر محرم کی مجلسوں میں مصروف تھے اس لئے مجھے زیادہ وقت نہ دے پائے مگر انہوں نے بڑی اپنائیت سے قلم کے ایک خوبصورت سیٹ کا تحفہ دیا۔ جسے میں نے ان کی یاد کے ٹوکن کے طور پر سنبھال کر رکھ لیا ہے۔ اس کے بعد ایل اے کے چند مشاعروں کی ویڈیو دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں جمیل الدین عالیؔ کے دوہے بہت پسند آئے۔

عالیؔ جی ہوں یا احمد فرازؔ، سردار جعفری ہوں یا شہریار غرض اردو دنیا کے بہت سے جانے مانے شاعر و ادیب نیر آپی کے مہمان رہ چکے ہیں۔ ان کے یہاں ایک چوبی تختی دیکھی جو کسی مشاعرے کی یادگار تھی۔ اسے واقعی ایک یادگار بنا دیا گیا تھا کہ اس پر اردو کے مشہور شعراء کرام کے دستخط کندہ تھے۔ یہ نیر آپی کی سادگی تھی یا بڑا پن کہ مجھ سے بھی ایک کنارے دستخط کرالیا!



http://www.kitaabghar.com
urdukutabkhanapk.blogspot.com

تصوراتی بہشت میں ایک دن

والٹ ڈزنی تقریباً ۲۰ سال تک ایک خواب دیکھتا رہا۔ وہ آنے والے کل کی منظر کشی کرنا چاہتا تھا۔ ایک ایسی تفریح گاہ جہاں لوگ اپنی روز مرہ کی الجھنوں کو بھول کر خوابوں کی بستی میں کھو جائیں۔ لوگوں نے اسے باتونی اور بے وقوف سمجھا مگر ۱۷ر جولائی ۱۹۵۵ء کی ایک روشن صبح والٹ ڈزنی نے اپنے خواب کی تعبیر پالی۔ اپنی بیٹیوں کے لئے ایک پارک اور فیملی تفریح گاہ سے شروع ہونے والے اس کے خواب نے ایک عالمی تفریح کا سامان مہیا کر دیا تھا۔

اس Showman of the world کو پتہ تھا کہ وہ اپنی کوششوں سے ڈزنی لینڈ کو Magic Kingdom جادو کی سلطنت اور دنیا کی سب سے پرسکون اور پرمسرت جگہ بنا دے گا۔ اس نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا تھا:

''ڈزنی لینڈ ان خوابوں، خیالوں اور کاوشوں اور نمونہ کمال کے نام منسوب ہے جس سے امریکہ وجود میں آیا — اس امید کے ساتھ کہ یہ ساری دنیا کو خوشی اور تفریح کا سامان اور امن وآشتی کا پیغام دیتا رہے گا۔''

ڈزنی لینڈ عالمی مسرتوں کا گہوارہ اور خواب اور اس کی تعبیر کی زندہ مثال ہے۔ اب تک دو سو چالیس ملین ہر عمر اور ہر دیس کے بچے اس جادونگری میں آچکے ہیں۔ جن میں بادشاہ، ملکائیں، شہزادے و شہزادیاں، وزیر اعظم اور صدر پچھلے تیس سالوں سے ایک عمر کی خوشیاں بٹور کر واپس ہوئے ہیں۔ تقریباً ایک سو اسی ایکڑ زمین پر پھیلے ہوئے اس پرستان پر افتتاح کے وقت ۱۷ لاکھ ڈالر خرچ ہو چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ڈزنی لینڈ کبھی مکمل نہیں ہوگا۔ وقت اور دنیا کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس تصوراتی بہشت میں ۲۰ ہزار چاق و چوبند کارکن سرگرم عمل ہیں۔ یہاں پریوں کے محلات، گھنے جنگلات جو کئی ہزار رقبے پر اگائے گئے ہیں اور دو سو ایکڑ زمین پر پھیلی مصنوعی جھیلیں، پہاڑ، بحری جہاز، اصلی سب میرین بیڑہ اس کے علاوہ مصنوعی ربر اور فائبر کے پرندے، درندے، مچھلیاں، سانپ اور کیا کچھ نہیں ہے۔ اس کے انتظام و اہتمام پر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

لاس اینجلز کے ڈاؤن ٹاؤن سے کوئی ۲۷ میل دور جنوب مشرق میں ۴ نمبر روٹ پر اینا ہیم کے علاقے میں ڈزنی لینڈ آباد ہے۔ میں جب اس جادونگری کے گیٹ پر پہنچا تو صبح کے نو بجا چاہتے تھے مگر کچھ نہیں تو پچاس افراد لائن میں کھڑے تھے۔ ٹکٹ کے کئی کاؤنٹر کھلے تھے پھر بھی بھیڑ بہت تھی۔ خدا خدا کر کے میرا نمبر آیا بارہ ڈالر کا پاسپورٹ/ٹکٹ لیکر میں اس الف لیلوی شہر میں داخل ہوا۔ گو میرے ہاتھ میں ڈزنی گائیڈ بک تھی مگر خوشیوں سے روشن چہروں کو دیکھ کر میں نے گائیڈ بک جیب میں رکھ لی اور خود سے بھٹکنے کے لئے تیار ہو گیا۔

ٹاؤن اسکوائر کے گیٹ سے داخل ہو کر ہم مین اسٹریٹ یو ایس اے پر آ گئے۔ پاس سے ایک ٹرام گزری جسے گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ منظر ایک صدی پہلے کا تھا۔ کچھ فاصلے پر قدیمی دمکل فائر انجن کہیں آگ بجھانے کے تیار ہو رہا تھا۔ اوروں کی دیکھا دیکھی ہم بھی لپک کر ایک پرانی موٹر پر سوار ہو گئے جس میں میرے بچن کے ساتھی جیسے مکی ماؤس اور ڈونالڈ ڈک سوار تھے۔ میں ان ساتھیوں کے ساتھ تصویر اتارنے کیلئے مچل اٹھا۔ قریب بیٹھی ہوئی ایک لڑکی نے اس شرط پر تصویریں اتاریں کہ بعد میں میں اس کی تصویر اتاروں۔ کیمرہ کلک ہوا اور ہم سب ہنس پڑے۔ مجھ پر اس جادونگری کا جادو اثر کر چکا تھا۔ یہاں آتے ہی بچے، جوان، بوڑھے سب الٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ ان ساتھیوں کو چھوڑ کر آگے بڑھے۔ سٹی

ہال کے باہر ایک بورڈ پر لکھا تھا :

''گمشدہ والدین اپنے بچوں کے بارے میں یہاں معلوم کریں۔''

مین اسٹریٹ ۱۸۹۰ء سے لیکر ۱۹۱۰ء کے امریکہ کی عکاسی کرتا ہے۔ یہاں گیس کے اسٹریٹ لیمپ اور اولڈ ڈوبن کاریں اور پتھر کی گلیاں، عہد ماضی کی سنہری یادوں کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ یہیں مین اسٹریٹ سنیما ہاؤس ہے جہاں مکی ماؤس کی کارٹون فلمیں چل رہی ہیں۔ یہیں سے ڈزنی ریل روڈ پورے ڈزنی لینڈ کا سفر کرتی ہے۔ ۱۸۹۰ء کی بھاپ کے انجن والی اس ریل پر ہم اس لئے سوار نہیں ہوئے کہ ایسی ریل اب بھی ہمارے یہاں چل رہی ہیں۔ ہاں امریکی بڑے شوق سے اس عجیب وغریب ریل پر سوار ہو رہے تھے۔ ان کے لئے بھاپ کی ریل اس دور میں عہد ماضی کی یادوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔

مین اسٹریٹ سے نکل کر ہم Adverture Land کی طرف بڑھے۔ سامنے ایک دیو قامت درخت تھا جس پر کئی منزلہ مکان بنا ہوا تھا۔ اس انوکھے درخت کو دیکھتے ہی بچپن میں دیکھی ایک فلم Swiss Family Robinson یاد آ گئی۔ جوہان وائس کے ناول کی فلمی تشکیل ۱۹۶۱ء میں والٹ ڈزنی نے کی اور ایک سال بعد ڈزنی لینڈ میں اس درخت کو زندگی بخش دی گئی۔ میں کیا کوئی بھی اس درخت کو دیکھ کر اصلی کہے گا۔ اس کے تنے، چھال، ٹہنیوں کا قدرتی خم، درخت کا رنگ، پتوں کی رنگت، لٹکتے ہوئے بیل اور جڑیں سب پر اصلی کا دھوکہ ہوتا ہے مگر یہ اصلی نہیں۔

اس درخت میں چھ ٹن اسٹیل اور ۱۱۰ کیوبک یارڈ سیمنٹ گارے کا استعمال ہوا ہے۔ تقریباً تین لاکھ نقلی پتیاں بہترین دستکاریوں نے پلاسٹک اور وائنل سے تیار کیں۔ ۸۰ فٹ اونچے اس عجوبے کا وزن ۱۵۰ ٹن ہے۔ اس شجری آشیانے کی چوٹی پر لکڑی کی بنی سیڑھی سے ہم بھی خراماں خراماں پہنچے۔ اس درخت کے نیچے کوئیں کی چرخی لگی ہے۔ پانی کو اوپر لے جانے کیلئے لکڑی کے ڈول استعمال کئے گئے تھے۔ پرانے طرز کے اس مکان میں ضرورت زندگی کی ہر چیز موجود تھی۔ خواب گاہ، بستر، باورچی خانہ، شراب کی پرانی بوتلیں، لکھنے پڑھنے کی میز، لالٹین، اس کی چوٹی سے پورا ڈزنیلینڈ نظر آ رہا تھا۔

ڈزنی لینڈ پارک میں سات خاص تفریحی علاقے یا سیکشن بنے ہیں۔ مین اسٹریٹ، ایڈونچر لینڈ، نیو اورلین اسکوائر، بیئر کنٹری، فرنٹیئر لینڈ، فنٹاسی لینڈ، ٹومارو لینڈ انہیں علاقوں میں ڈزنی کی پوری دنیا آباد ہے۔ ساتھ ہی بیشمار ریستوراں، گفٹ شاپ، اسٹوڈیو، سنیما ہاؤس میوزیم، بازار بینک، لاکرز، معذور سیاحوں اور بچوں کے لئے وہیل چیئر رینٹل اور ایک فرسٹ ایڈ کا رموجود ہے۔

ہم نے پھولوں کو مسکراتے اور بلبلوں اور کوئلوں کو گاتے صرف کتابوں میں پڑھا تھا مگر ٹکی روم کے پھولوں اور پرندوں کو جھومتے، قہقہہ لگاتے اور باضابطہ کورس گیت گاتے دیکھا۔ ۱۹۶۳ء میں والٹ ڈزنی کے تخیل نے Audio Animatronics اور کمپیوٹر کی مدد سے اس سحر انگیز ٹکی روم کا آغاز کیا جس میں ۲۵۰ قسموں کے پھول اور خوش الحان پرندے ہیں۔

ٹکی روم میں مجھ سمیت کوئی ۷۰ افراد موجود تھے۔ ایک اعلان کے ساتھ شو شروع ہوا۔ روشنی دھیمی کر دی گئی۔ جب ہم اس کمرے میں داخل ہوئے تو سارے پرندے خاموش تھے مگر اعلان کے ساتھ ایک خوش شکل محترمہ ہاتھ میں ایک چھڑی لئے داخل ہوئیں۔ سبھوں کو خوش آمدید یعنی ہائے کہا اور ایک اشارے پر پرندوں نے تیز موسیقی پر اپنا آموختہ دہرانا شروع کر دیا۔ اس کورس میں کچھ پہاڑی برازیل کے طوطے اونچی آواز میں الاپ لگاتے تو چند چھوٹے پرندے نیچی سروں میں آواز ملا رہے تھے۔ گانے کے دوران پرندے ایک دوسرے سے مذاق بھی کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ پھول جھوم جھوم کر ان کے ساتھ گانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لائٹ اینڈ ساؤنڈ کے اس عجوبے کو لوگ سانس روکے دیکھ اور سن رہے تھے جنگل کی اس حسین شام، ہر برادری کے پرندے اور پھول پودے اپنی خوشی، کورس اور جماعت سے ہمیں یہ سبق دے رہے تھے کہ انسانو! اب بھی

اپنے اختلافات ختم کر کے ایک ہو جاؤ اور ہماری طرح ہنستے گاتے زندگی گزارو۔

کمپیوٹر کا کمال تھا کہ ٹکی روم میں آواز، روشنی اور موسیقی کو ہم آہنگ کر دیا تھا۔ اس رنگ ورامش کے کمرے نے ثابت کر دیا تھا کہ انسانی تخیل جو کچھ سوچ سکتا ہے اس کی تخلیق بھی ناممکن نہیں۔

ٹکی روم کے احاطے میں ریڈ انڈین شکلیں اور نقاب اور تیر کمان سجے تھے اور ایک اسٹال پر ہوائی کے اناس بک رہے تھے۔ مجھے پیاس لگی تھی۔ یہیں ایک ڈالر کا جوس لیا اور ٹکی روم کے پھول اور پرندوں کے بارے میں سوچا کئے!

ایڈونچر لینڈ میں سب سے قابل دید جنگل کروز ہے۔ ہم ایک موٹر لانچ کے ذریعہ دنیا کے خطراک جنگلات والے بحری سفر پر نکلے۔ میرے ساتھ تیس افراد تھے۔ ساتھ ہی ایک رائفل بردار گائیڈ بھی تھا جو اس سفاری لانچ میں آنے والے خطرات سے ہمیں آگاہ کر رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں ہم گھنے جنگلات سے گزر رہے تھے جہاں سورج کی روشنی نہیں پہنچ رہی تھی اور ماحول بڑا پراسرار تھا۔ مسلسل بارش کی جھنکار میں گائیڈ کی آواز دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم لوگ افریقہ کے جنگلات سے گزر رہے تھے۔ اچانک گائیڈ نے سبھوں کو ہشیار کیا اور فائر ہوا۔ پیچھے سے ایک مگرمچھ منہ پھاڑے حملہ آور ہوا چاہتا تھا کہ گائیڈ نے اسے نشانہ بنالیا تھا۔ اب ہر کوئی خوف زدہ ہو کر سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا، بارش اور ہریری نے مل جل کر ایک عجیب ماحول پیدا کر دیا تھا۔ سامنے ہاتھیوں کا ایک شریر جوڑا ایک دوسرے پر پانی کے فوارے اچھال رہا تھا۔ یہاں سندر بن اور کانگو کے ہاتھی ساتھ رہتے ہیں۔ اچانک قریب ہی کچھ سرسراہٹ ہوئی۔ دیکھا ایک اژدہا درخت پر چڑھ رہا تھا اور ایک جنگلی بیل اسے دیکھ کر پھنکار رہا تھا۔ دوسرے کنارے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ میں ایک چیتا پہلو بدل رہا تھا اور ایک ہرن پر جھپٹنا چاہتا تھا، کچھ دور بارہ سنگھوں کا ریوڑ چوکڑی بھرتا گزر رہا تھا۔ ایک زرافہ اپنی مادہ کو لئے پتہ نہیں کس خوف سے دم سادھے ایک جانب دیکھ رہا تھا۔ اب ہم کھلے آسمان کے نیچے آ گئے تھے۔ فضا صاف اور دھوپ کی روشی میں اب جنگل کی خوبصورتی اچھی لگ رہی تھی۔ دور ایک پہاڑی کے دامن میں جنگل کا بادشاہ اپنے خاندان کے ساتھ دعوت خاص میں مشغول تھا۔ بیچارہ زیبرا اب تک تڑپ رہا تھا۔ شیرنی اس کی گردن سے خون چوس رہی تھی۔ جھاڑی کی اوٹ سے گیدڑ اپنے حصے کا انتظار کر رہا تھا۔ درختوں پر بندروں نے اچھل پھاند لگا رکھی تھی۔ ایک بدمست گینڈا ایک درخت کے نیچے کھڑا پھنکار رہا تھا۔ چند شکاری اپنی جان بچانے درخت پر چڑھے تھے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ ہم اصلی نہیں بلکہ نقلی ایمزان اور جنگلات کے درندوں سے خوفزدہ نہیں تھے۔ گو ہمیں علم تھا کہ سارے درندے میکانیکل تھے اور کمپیوٹر کے حکم سے دم ہلا رہے تھے مگر، آنکھیں جھپکا رہے تھے اور ایک دوسرے پر حملہ آور ہو رہے تھے مگر ماحول کچھ ایسا تھا کہ سب حقیقی لگ رہے تھے۔ ہاں ان جنگلات کو اگانے اور بڑھانے میں کافی وقت لگا تھا۔ ساتھ ہی پانی اور خشکی کے جانوروں کی دیکھ بھال میں چڑیا خانے کے اصلی جانوروں سے زیادہ خرچ اور مشکلات کا سامنا تھا۔ ہم دوسرے ہم سفروں کے ساتھ خیریت سے اس بحری سفر سے واپس لوٹے۔

دوپہر ہو چکی تھی اور ابھی گنتی کی چیزیں دیکھی تھیں۔ ابھی تسخیر کے لئے ایک دنیا پڑی تھی۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ قریب ہی ٹاہیٹی ٹریس ریستوران میں پولینیشن ڈشیں بک رہی تھیں جو میرے مطلب کی نہیں تھیں۔ اسٹیک کے نام پر کچا گوشت کھانے کے بجائے میں نے گریگ سلاد لیا اور سن کسٹ کی ٹھنڈی بوتل سے ہرے پتوں کو حلق سے اتارا!

اسکول کے زمانے میں، ہمارے محلے میں مداری والے ریچھ لے کر آتے تھے اور ہم بڑے شوق سے ریچھ کو ڈگڈگی کی تھاپ پر ناچتے تھرکتے دیکھا کرتے تھے۔ والٹ ڈزنی نے ضرور یہ تماشہ کسی انڈین ڈاکومنٹری میں دیکھا ہوگا۔ بس ۱۹۷۲ء میں جمبوری کنٹری بیئر کی بنیاد ڈالی۔ ریچھوں کے کرداروں کو بنایا فریڈ، زیب اور ٹیڈز یکی گومر، ٹیرسینس اور ٹیڈی بیرء وغیرہ منجھے ہوئے نوٹنکی والوں کی طرح اسٹیج پر نہ صرف ناچتے گاتے

ہیں بلکہ پورے انہماک سے پیانو، ماؤتھ آرگن، ڈرم ساتھ ہی ڈش پین اور واش بورڈ بجاتے ہیں۔ ۱۸ ریچھوں کی ٹولی اپنے فن اور موسیقی سے ایک سماں باندھ دیتے ہیں جسے ہر عمر کے بچے، جیسے ہم اور آپ نہ صرف پسند کرتے ہیں بلکہ سیٹی بجا کر تالیاں پیٹ کر ایک طوفان برپا کر دیتے ہیں اور شریر و معصوم ریچھ جھک جھک کر آداب کرتے ہیں۔

نیو اورلین اسکوائر میں بھوت بنگلہ کے صدر دروازے پر ایک نوٹس لگا تھا کہ ''تمام بھوتوں اور بدروحوں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ بنگلہ کرائے پر دستیاب ہے۔ بے چین روحوں کو کھلی اجازت ہے کہ آس پاس والوں کو جس طرح اور جیسے چاہیں پریشان کریں۔''

نہ مجھے بھوتوں سے ڈر لگتا ہے نہ ہی میں ان پر یقین رکھتا ہوں۔ اس لئے میں نے اس دلچسپ بنگلے کی سیر نہیں کی۔ یہ ہماری دیسی فلموں کا بہت گھسا پٹا مسالہ تھا۔

میں نے Pirates of caribbean کریبین کے قزاق کی بڑی تعریف سن رکھی تھی۔ اس کے گیٹ پر بھی لوگوں کی لمبی لائن کھڑی تھی۔ لوگ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر ایک اندھیرے غار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک دریا غار سے بہتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا تھا۔ نمبر آتے ہی ہم بھی چھ افراد کی ایک کشتی میں بیٹھ گئے۔ اندر خاصا اندھیرا تھا اور دور دور مشعل روشن تھی۔ کشتیاں ابھی کچھ ہی دور بڑھی تھیں کے تیز بہاؤ والے آبشار کے ریلے میں آ گئیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم بڑی بلندی سے نیچے کی طرف گر رہے ہیں اور کشتی اب الٹی اور سب ڈوبے۔ ایک شور برپا تھا۔ عورتیں اور بچے چیخ رہے تھے مگر تیزی سے ہم ایک ہموار سطح پر آ گئے۔ سب نے ایک دوسرے کو صحیح سلامت دیکھا تو ہنسنے لگے دراصل کشتیاں لوہے کی پٹریوں پر چل رہی تھیں جو پانی کے نیچے لگی تھیں اور ڈھلان پر یہ کشتیاں پٹریوں سے گزری تھیں۔

اب ہم کھلے آسمان کے نیچے قزاقوں کی بستی کے قریب پہنچ رہے تھے۔ کنارے ایک انگریز بوڑھا ملاح پائپ پی رہا تھا۔ کنارے پر قدیم محلات اور ٹوٹے ہوئے قلعے نظر آ رہے تھے۔ ماحول اٹھارہویں صدی کے بحری سفر اور ان کے مسائل کا تھا جب بحری قزاق سپینش مین میں قیامت ڈھا رہے تھے۔

ہم ایک لکڑی کے پل کے نیچے سے گزر رہے تھے جس پر دو ڈاکو آپس میں لڑ رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر آگ لگی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے قزاقوں کی ٹولی یہاں لوٹ مار کر کے گئی ہے۔ ہر سو چیخ و پکار مچی تھی۔

ہم آگے بڑھے۔ قزاقوں نے یہاں پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ لوٹے ہوئے مال اور دوشیزائیں نیلام ہو رہی تھیں۔ شراب کے نشے میں دھت ڈاکو دست درازی میں مصروف تھے۔ کچھ دوشیزائیں سہمی سہمی تھیں اور کچھ عشوے اور غمزے میں مصروف تھیں۔ ایک ڈاکو پہرہ دے رہا تھا انہوں نے کچھ جوانوں کو قید بھی کر رکھا تھا۔ صندوقوں میں بھرے زیور، ہیرے جواہرات، سونا چاندی انہوں نے پتہ نہیں کس کس جہاز سے لوٹا تھا اور کتنوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں قزاقوں کا مسکن اپنی مثال آپ ہے۔

قزاقوں سے بچ کر ہم ایک بار پھر امریکہ کے دریاؤں سے ہوتے ہوئے دنیا کی سیر کو نکل پڑے۔ فرنٹیئر لینڈ کے ساحل پر لگا ہوا کولمبیا جہاز اس بحری جہاز کی ہو بہو نقل ہے جو ۱۷۹۰-۱۷۸۷ء میں امریکہ سے دنیا کا چکر لگانے کیلئے نکلا تھا۔ کولمبیا ۱۴ر جون ۱۹۵۸ء میں ڈزنی لینڈ کے دریا میں اتارا گیا۔ ہم نے جہاز کی تیسری منزل پر ایک کنارے پناہ لی اور ڈزنی لینڈ کی تصویر اتارتے رہے۔ جن جنگلات سے کولمبیا گزر رہا تھا وہاں ریڈ انڈین قبائلیوں کا بسیرا تھا۔ ہم نے اس قبیلے کے لوگوں کو گھوڑے پر سوار شکار کرتے بھی دیکھا اور گھر کے آنگن میں عورتوں کو بچے کھلاتے دیکھا۔ کچھ جوان چمڑے کی مدد سے گھوڑے کی زین بنا رہے تھے تو کچھ تیر اندازی کی مشق کر رہے تھے ان کے مویشی اور گھوڑے درختوں کی اوٹ میں بندھے تھے جو جہاز کی آواز پر چونک کر مسافروں کو دیکھ رہے تھے۔

http://www.kitaabghar.com

کولمبیا سے اترے تو سامنے ایک اور عظیم الشان جہاز مارک ٹوئین کھڑا تھا جو ۱۰۵ فٹ لمبا تھا مگر میں بحری سفر سے تھک چکا تھا۔ اپنی تھکن دور کرنے کے لئے میں گولڈن ہارس شوریویو میں گھس پڑا۔ قدیم ٹکساس کی روایت کو لئے اس رقص وسرور کے شو نے میری تھکن دور کردی۔ اس شو نے اب تک ۴۳۰۰۰ پروگرام مکمل کر لئے ہیں اور Guines Book of World میں اپنا مقام بنالیا ہے۔

ڈزنی لینڈ میں آئندہ کل، آج نظر کے سامنے ہوتا ہے اور گزشتہ کل دائمی ہو جاتا ہے۔ یہاں ماضی لافانی ہے۔ مگر ان تکنیک اور کمپیوٹر کے غلاموں کے باوجود والٹ ڈزنی وقت کی رفتار کو اپنے طابع نہ کر سکا۔ تمام خوشیوں کے باوجود ہمیں یہ فکر کھائے جارہی تھی کہ وقت کی آئس کریم گھلتی چلی جارہی ہے سہ پہر کے چار بج رہے تھے اور :

''تم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے''

یہ تو پتہ تھا کہ ایک دن میں ڈزنی کی جنت گھومنے سے رہے۔ اس کیلئے تو ایک ہفتہ بھی کم ہے۔ اچانک یاد آیا کہ مین اسٹریٹ پر چار بجے مکی ماؤس کا شاہانہ جلوس نکلنے والا ہے۔ بس کشاں کشاں ہم مین اسٹریٹ پہنچے۔ ایک خلقت پہلے سے جمی بیٹھی تھی۔ ہزاروں بچے، مرد، عورتیں، بوڑھے ہر رنگ ونسل کے لوگ امریکہ کی دوصد سالہ پریڈ دیکھنے کے لئے جمع تھے۔

بینڈ کی آواز کے ساتھ ہمارے سامنے سے قد آدم مکی ماؤس، ڈونالڈ ڈک، پلوٹو، گوفی، پی نو چیو، سنیزی، ڈوپی اور ساتھ میں ڈزنی کے لاتعداد کردار گزر رہے تھے۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر تماش بینوں کو سلام کر رہے تھے۔ ہاتھ ملا رہے تھے۔ وہ ملاح بھی اپنی کشتیاں لئے ساتھ تھے جو نئی دنیا کی کھوج میں نکلے تھے۔ انہیں تمام دشواریوں اور آزمائشوں کے بعد ایک ایسی سرزمین مل گئی تھی جو ان کی منزل مقصود تھی۔ ان کے ہاتھوں میں امریکہ کی آزادی کی سالگرہ کا کیک بھی شامل تھا۔

ڈزنی لینڈ کا ایک کونا ایسا بھی تھا جہاں ساری دنیا سمٹ آئی تھی۔ دنیا کے چھ براعظموں کی بیشتر قوموں کے بچے، ننھے منے دلکش کھلونوں کے روپ میں دھیمی موسیقی پر ایک کورس گا رہے تھے۔ Its a smal world

شام چھ بجا چاہتے تھے۔ میں تھک کر چور تھا مگر ڈزنی لینڈ سے جانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ہم نہ تو ابھی اڑتے ہوئے ڈمبو ہاتھی پر بیٹھے تھے، نہ اسکائی وے میں اڑتے ہوئے ڈزنی کا جائزہ لیا تھا۔ نہ ہی فنتاسی لینڈ کے آٹو پیہ موٹر کار میں بیٹھ کر اپنی مرضی سے گاڑی دوڑائی تھی نہ ہی سیلپنگ بیوٹی کا محل دیکھا تھا اس کے ساتھ ہی ٹومارو لینڈ کی سب میرین میں بیٹھ کر سمندر کی تہہ کی سیر کرنا تھا۔ اسپیس پہاڑوں کو تسخیر کرنا تھا نہ ہی راکٹ سے مریخ کی سیر کر پائے تھے۔ اتنی چیزوں کو دیکھ کر بھی جتنا دیکھا تھا۔ ایک دن میں ایک عمر کی خوشی بٹور ی تھی۔ اتنا ہنسے تھے کہ پوری آوارگی میں نہ ہنسے ہوں گے اور اب تک ہم ہنسے کہاں تھے۔ وہ تو لوگ ہنس رہے تھے............ پتہ نہیں کس پر!!

والٹ ڈزنی ۱۵ ردسمبر ۱۹۶۶ء کو ڈزنی لینڈ کے تمام کرداروں، کارکنوں اور تصوراتی بہشت کو چھوڑ کر اس دار فانی سے کوچ کر چکا ہے مگر اس کے بنائے ہوئے کردار لافانی ہیں۔ اس نے کہا تھا :

''جب تک انسانی تخیل جوان ہے ڈزنی لینڈ بھی جوان رہے گا — یہ کبھی مکمل نہیں ہوگا وقت اور زمانے کے ساتھ اس میں توسیع اور اضافے ہوتے رہیں گے!''



ہالی وُڈ کی بھول بھلیاں

کون ہے جو ہالی ووڈ کے نام سے واقف نہیں ہے۔ یہاں دولت اور شہرت کی چکا چوند، رومان، اسکنڈل، سیاست اور پس پردہ کی آہ اور واہ کی بے شمار داستانیں مشہور ہیں۔ گو بمبئی کی فلم نگری اب دنیا میں سب سے زیادہ فلمیں پروڈیوس کر رہی ہیں مگر ہالی وڈ کی بات ہی کچھ اور ہے۔

ہالی ووڈ کے شمالی علاقے میں مارچ ۱۹۱۵ء کی ایک خنک صبح کارل لیمیے نے یونیورسل اسٹوڈیوز کی بنیاد رکھی۔ فلم کا دوسرا نام جوا ہے۔ کارل اس جوئے میں کامیاب ہوا۔ ۴۲۰/ ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا یونیورسل اسٹوڈیوز اپنے اندر ایک شہر بسائے ہوئے ہے اور دنیا کا سب سے بڑا فلمی کارخانہ ہے۔ ۱۹۶۴ میں یونیورسل اسٹوڈیوز کے دروازے عوام کے لئے کھول دئے گئے ہیں اور باقاعدہ گائیڈیڈ ٹور کا انتظام کیا گیا۔ اس طرح پردے کے پیچھے اور کیمرے کے سامنے کی شوٹنگ، تکنیک، لائٹ اینڈ ساؤنڈ ایفکٹ اور بھولے عوام کو بے وقوف بنانے والی دھاندلی اور کیمرہ ٹرک سارا کچا چٹھا آپ کے سامنے بیان کیا جانے لگا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ سب کچھ دکھا دینے کے باوجود ویسٹرن پکچر کی امپیکٹ برقرار رہتی ہے۔ اب تک ۴۵ ملین لوگوں نے یونیورسل اسٹوڈیوز کا چکر لگایا گیا ہے۔

ہم بھی فلم والوں کی جادونگری دیکھنے یونیورسل اسٹوڈیوز پہنچے۔ لائن کی لمبائی دیکھ کر ماتھا ٹھنکا مگر یورپ اور امریکہ والے بڑے صابر ہیں۔ خاموشی سے لائن میں اپنی باری کا انتظار کر لیتے ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ ــــ ٹکٹ لے کر میں تقریباً ۵۰/ افراد کی ٹولی کے ساتھ ایک بس پر سوار ہوا۔ ایک خوبصورت میزبان گائیڈ ہاتھ میں مائیک لئے سبھوں کو ویل کم کہتی ہے اور ہمارا سفر شروع ہوتا ہے۔ یونیورسل پہاڑی کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ بس وادی سے چلتے ہوئے بلندی کی طرف جارہی تھی۔ موسم خوشگوار اور سورج چمک رہا تھا۔ ایک اونچے مقام پر بس روک کر ہمیں ہالی ووڈ کا سائن دکھایا گیا۔ ایک پہاڑی پر کندہ نام ''ہالی ووڈ'' دراصل ۱۹۳۲ء کا ہالی وڈلینڈ کمپنی کا نشان تھا۔ اس وقت یہ علاقہ غیر آباد تھا اور اس زمانے میں فلمیں نیویارک میں بننا شروع ہوئی تھیں۔ M.G.M کا دور دورہ تھا مگر نیویارک کی برف بازی اور سردی کی شدت میں چھ ماہ برباد ہوتے تھے۔ اس لئے ہالی ووڈ کا علاقہ فلمی صنعت کیلئے منتخب ہوا جہاں ہر موسم اور ہر ماہ کام میں لایا جاسکتا تھا۔

ہم لوگ بڑے شوق سے اپنی گائیڈ کی باتیں سن رہے تھے کہ اچانک گڑگڑاہٹ سی ہوئی اور بس جھٹکے کھانے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی زوردار زلزلہ آنے والا ہے۔ سبھوں کے چہروں سے پریشانی عیاں تھی۔ بس یوں ہچکولے کھا رہی تھی کہ اب الٹی تب الٹی۔ اتنے میں اوپر سے بڑی بڑی چٹانیں لڑھکتی ہوی ہماری طرف آرہی تھیں۔ کچھ عورتیں اور بچے چیخنے لگے اس پر گائیڈ صاحبہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور بتایا گھبرانے کی ضرورت نہیں یہ ہمارے سفر کا پہلا خطرناک مذاق تھا۔ زلزلہ اصلی نہیں بلکہ ساؤنڈ ایفیکٹ والا تھا اور پتھر وغیرہ ربر کے تھے۔ فلموں میں زلزلے کی شوٹنگ ایسی ہی تکنیک سے کی جاتی ہے اور لوگ دہل جاتے ہیں۔

ایک مقام پر لے جا کر بس روک دی گئی۔ سب نیچے اترے۔ یہاں ہماری میزبانی کے لئے ایک اور نازک اندام گائیڈ تیار تھی۔ سامنے ایک قد آدم سائن بورڈ پر یونیورسل ڈریسنگ روم لکھا تھا۔ اوروں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی یہاں ایک تصویر اتار لی۔ گائیڈ ہمیں لئے میک اپ روم میں داخل ہوئی۔ تقریباً ہر بڑے چھوٹے فلمی اسٹار نے یہاں میک اپ کیا ہے۔ اس سے متصل ڈرائنگ روم اور وارڈ روب تھا جہاں ہزاروں کی تعداد

میں کاسٹیوم سجے ہوئے تھے۔ان میں وہ خاص ملبوسات بھی تھے جنہیں انعام واکرام سے نوازا جاچکا تھا۔ان میں آٹھ آسکر ایوارڈ بھی شامل ہیں جس کی ڈیزائنر میڈیم ایڈت ہید ہیں۔اس کے پیچھے ایک بہت بڑا اسٹور روم ہے جسے Prop. Room کہتے ہیں۔اپنے دامن میں پچاس لاکھ نادر ونایاب سیٹ کے ذخیرے جن میں جھاڑ فانوس، تیروتلوار، تخت وتاج، کھمبے تمبو، شاہی لباس وغیرہ وغیرہ سمیٹے ہے۔ڈریسنگ روم کے ساتھ ہی کچھ گیسٹ روم ہیں جن میں اکثر رات کی شوٹنگ کے دوران فلمی ستارے رکتے اور آرام کرتے ہیں۔

ہم باہر نکلے تو سنا آج کی شب Steven Spielberg کی فلم Back to the future کی ڈبنگ ہونے والی ہے۔

کچھ ہی فاصلے پر ایک مکان کو جلتے دیکھ کر سب کی نگاہیں ادھر اٹھ گئیں پتہ چلا آگ اصلی ہے مگر مکان صرف سامنے کے درودیوار اور کھڑکی لئے مکان کا ماڈل ہے جو کئی برسوں سے روز جلتا ہے مگر تباہ نہیں ہوتا۔اسے کئی فلموں کے آگ کے سین میں استعمال کیا گیا ہے۔

اب ہم لوگ یونیورسل ساؤنڈ اسٹیج کے فرنٹ لاٹ میں داخل ہوئے۔یہاں ایسے ۳۵ ساؤنڈ روم موجود ہیں جہاں ڈریکولا، فرینکسٹائن دی اسٹنگ، دی بسٹ لٹل ہور ہاؤس ان ٹکساس کی شوٹنگ اور صدابندی ہوئی ہے۔اس کے بعد ہم اسپیشل ایفیکٹس اسٹیج میں داخل ہوئے۔گائیڈ نے بڑی ادا سے ہمیں بتایا کہ فلم والے پردے پر جو کچھ کرتے ہیں آیئے اس کے راز آپ کو بتائیں۔

یہاں قوی ہیکل دینوسارس کے ننھے منے ماڈل رکھے تھے جسے کیمرہ ٹرک سے بڑا کردیا جاتا ہے۔ساتھ ہی مشہور حالیہ فلم E.T میں کس طرح ایک بچے کو خلا میں سائیکل چلاتے دکھایا گیا ہے۔کمپیوٹر اور ٹکنالوجی کی مدد سے اسپیل برگ کی فلم ۱۹۴۱ میں کیسے تفریحی پارک کو تباہ وبرباد ہوتے دکھایا گیا تھا۔

Earth Quake میں زلزلے کی شدت سے عمارتوں کی بنیادوں کو ہلتے دکھایا تھا جو یونیورسل اسٹوڈیو کے نیویارک اسٹریٹ پر شوٹ ہوئی تھی۔یہ سب ساؤنڈ ایفیکٹ اور کیمرہ ٹرک کا کمال تھا۔

اسی نیویارک اسٹریٹ کو Ironsides اور Dirty hary میں سان فرانسسکو اور The Sting میں شکاگو شہر کی شاہراہ کے طور پر دکھایا گیا ہے۔یہی نہیں اس نیویارک اسٹریٹ کو بھائی لوگ کسی بھی ماڈرن شہر کی شاہراہ بنا کر شوٹ کر لیتے ہیں۔

اب ہم گلی کوچوں سے نکل کر دوبارہ بس میں بیٹھے اور چل پڑے۔کچھ ہی فاصلے پر گہری کھائی تھی اور ایک پرانا سا لکڑی کا پل تھا۔بس پل پر سے گزری تو چوبی پل کی بنیاد ہلنے لگی اور پرانی لکڑی چرچرانے لگی۔بس بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔گائیڈ نے کہا معاف کیجئے یہ پل بہت پرانا ہے مگر ہم اس پار ضرور جائیں گے لیکن جس بات کا سب کو خدشہ تھا وہی ہوا۔اچانک ایسا لگا کہ پل ٹوٹ جائے گا۔اس سے پہلے کہ کچھ کہا جاتا ایک زوردار آواز کے ساتھ بیچ سے آدھا پل بیٹھ گیا اور تقریباً ہر کوئی چیخ پڑا۔ساتھ ہی لوگ ہنس پڑے۔ہنستے ہوئے گائیڈ نے بتایا کہ پل گرا نہیں بلکہ دوفٹ گرایا گیا تھا۔مضبوط ہائیڈرولک لفٹ نے اسے سنبھال لیا۔بقیہ ڈرامہ ساؤنڈ کا تھا۔فلم میں یہی چیز کیمرہ سے اور بھی خطرناک بن جاتی ہے۔ہم لوگ ہنستے ہوئے خوشی خوشی پل پار کر ہی گئے۔

اب ہم Any town - U.S.A سے گزر رہے تھے۔آج یہاں کی گلیاں اور مکانات خاموش تھے مگر شوٹنگ میں یہی گلیاں اور مکانات امریکہ کے کسی بھی چھوٹے شہر یا مین اسٹریٹ میں بدل جاتے ہیں۔یہاں کچھ مکانات جانے پہچانے لگ رہے تھے۔ان میں ایک آسیب زدہ مکان ہچکاک کی مقبول فلم ''سائیکو'' اور پھر ''سائیکو II'' میں استعمال ہوا تھا۔ان ہی مکانات میں......

The Beaver اور Daris Day کی شوٹنگ بھی ہوئی ہے۔اب ہم کھلے میدان سے گزر رہے تھے۔منظر یا سیٹ لندن کے کسی قریبی گاؤں کا ہے چھک چھک کرتی بھاپ والی ریل گزر رہی تھی۔چھوٹا سا چوبی پلیٹ فارم بھی بنا تھا۔یہ کسی ٹی سیریل کی شوٹنگ کی تیاری تھی۔کچھ

فاصلے پر دو گھوڑے اپنے کاؤبوائے Cow Boy سوار کا انتظار کر رہے تھے۔

حضرت موسیٰ نے بحیرۂ قلزم میں اپنا عصا پھینک کر سمندر کو دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔اسی معجزے کو سیسل بی ڈی مل نے مشہور فلم The Ten Commandments میں فلمایا تھا۔ہم نے نہ صرف اس فلم کو دیکھا تھا بلکہ اس سین پر کافی بحث کی تھی مگر سمجھنے سے قاصر تھے کہ یہ ٹرک کیوں کر ممکن ہے۔آج بڑے شوق سے ہم اسے دیکھنے پارک لیک کی طرف بڑھ رہے تھے۔جیسے ہی ہماری بس جھیل کے کنارے پہنچی بس ایک بریک کے ساتھ رک گئی۔گائیڈ نے سبھوں کو مل کر Sea Apart کا نعرہ لگانے کو کہا اور دیکھتے ہی دیکھتے جھیل دو حصوں میں تقسیم ہونے لگی اور ہماری بس جھیل پر ہچکولے کھاتے گزرنے لگی۔جھیل کی تہہ میں ایسے آلات فٹ تھے کہ زور پڑتے ہی جھیل کا فرش نیچے ہونے لگا اور ایک راستہ نکل آیا۔اس جگہ تقریباً چالیس ہزار گیلن پانی صرف تین منٹوں میں ڈرین پائپ کے ذریعہ سرک جاتا ہے۔ہم اس تکنیکی معجزے پر سر دھنتے آگے بڑھے۔اسی پارک لیک کو کبھی بحر اوقیانوس تو کبھی بحر الکاہل بنا دیا جاتا ہے۔......یہیں Mchale's Navy کی شوٹنگ ہوئی تھی۔

بس اب یورپین اسٹریٹ سے گزر رہی تھی ، یہاں یورپ کے پرانے طرز کی عمارتیں کھڑی تھیں۔اسی جگہ انتھنی کوئین کی مشہور فلم Hunchback of Notredam اور Tower of London کی شوٹنگ ہوئی تھی۔

ہماری خوبصورت گائیڈ نے اپنی مخصوص ادا سے ہمیں خبر دی کہ آج موسم کی پیشن گوئی کرنے والوں نے خبر بھیجی ہے کہ ۵۰ فیصد بارش ہوگی اور ۵۰ فیصد موسم خشک رہے گا۔یہ عجیب وغریب پیشن گوئی سو فیصد درست نکلی۔ہم ایک ایسے علاقے سے گزرے جہاں بس کے ایک طرف موسلا دھار بارش ہو رہی تھی مگر دوسری طرف موسم خشک تھا اور سورج چمک رہا تھا۔یہ سب کمپیوٹر اور ریموٹ کنٹرول سے ہو رہا تھا۔بھائی لوگوں نے موسم کے مزاج کو اپنے تابع کر لیا تھا۔جب سوئچ آن کیا بارش ہوگئی اور جب آف کیا مطلع صاف ہوگیا۔

دور سے ایک بڑے بورڈ پر Welcome to Amity لکھا نظر آیا۔ہم لوگ ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے۔یہاں کا ساحلی علاقہ سیاحوں سے بھرا رہتا ہے۔مگر آج ایک عجیب سی اداسی تھی۔شاید کوئی حادثہ ہوا تھا۔ہم سے اگلی بس کے سیاح آپس میں کھسر پسر کر رہے تھے۔پتہ چلا ابھی ابھی ایک مچھیرا اپنی چھوٹی سی کشتی میں بیٹھا مچھلی کا شکار کر رہا تھا مگر چند منٹ پہلے ایک بڑی سی شارک نے اسے نگل لیا تھا۔اچانک شور ہوا اور میں نے بھی پانی کی سطح پر بلبلے اور شارک کی پیٹھ کو ابھرتے دیکھا۔شارک، شارک! سبھوں نے ایک ساتھ چیخا! گائیڈ نے تسلی دی کہ بےفکر رہئے آپ سب اس بس میں محفوظ ہیں مگر اچانک ایک دیو قامت شارک نے پانی میں سے بس پر حملہ کیا۔لبِ ساحل کھڑی بس ایک چھوٹے سے پل کے ذریعہ دوسری طرف جانے کیلئے تیار تھی کہ اس حملے سے رک گئی۔۲۵ فٹ لمبی شارک جسے چبا ڈالنے والی مشین کا نام دیا گیا تھا دراصل مشہور فلم Jaws کی یہ مچھلی اب یہاں ایمیٹی کے ساحل پر خوف وہراس پھیلا رہی تھی۔فائبر کی بنی اس شارک نے اپنا جبڑا کھولا تو اچھے اچھوں کے دل بیٹھنے لگے مگر یہ ریموٹ کنٹرول سے اچھل رہی تھی اور جبڑا پھاڑ رہی تھی۔جیسے ہی پانی سے اچھلتے ہوئے اس نے جبڑا کھولا ایک ساتھ کئی کیمرے کلک ہوئے اور سبھوں نے شکریہ ادا کیا۔

سنا تھا کہ کیلی فورنیا میں بارش بہت کم ہوتی ہے۔مگر اس میکسیکی گاؤں میں گزرتے ہوئے ہم نے موسم کو یکسر بدلتے دیکھا۔یعنی جھما جھم بارش ہو رہی تھی اور پھر بادل اس قدر زور سے گڑگڑائے کہ بس کے بچے اپنی ماؤں سے چپک گئے۔ہم ایک پہاڑی کے دامن میں پہنچے ہی تھے کہ پتہ چلا کہ فلاں ڈیم کے بند ٹوٹ گئے ہیں۔پھر کیا تھا۔پانی کا ایک زوردار ریلا بس کی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ساتھ ہی ہوا تیز چلنے لگی اور آندھی کی شکل اختیار کر گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے درخت جڑ سے اکھڑ اکھڑ کر گرنے لگے۔سب اللہ اللہ کر رہے تھے مگر سیلاب کا پانی بس تک آنے سے پہلے ہی ایک موڑ پر رک گیا۔بارہ ہزار گیلن پانی کو بڑی کاریگری سے ڈرین پائپ کے ذریعہ گھما دیا گیا تھا جو گھوم کر دوبارہ پہاڑی کے بڑے ٹینک میں جمع ہو جاتا ہے

اور گرے درخت دوبارہ کھڑے ہونے لگے جو ریموٹ کنٹرول سے دوسری بس کے آنے تک سیدھے کھڑے رہیں گے۔ پھر وہی سیلاب اور وہی درختوں کا گرنا۔ ان لوگوں نے ''مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی'' والے مصرعہ کو سچ کر دکھایا تھا۔

اب ہم برفانی علاقے میں پہنچ گئے تھے۔ ہر طرف سفید برف جمی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے رات یہاں بہت برف گری ہے مگر ٹھنڈ کا احساس نہیں تھا۔ ابھی ہم اس برفباری کے متعلق سوچ ہی رہے تھے کہ سامنے سرنگ نظر آئی اور بس اس میں داخل ہوئی۔ اچانک ایک گڑگڑاہٹ سی ہوئی اور گائیڈ نے ہمیں بتایا کہ ہم گلیشئر میں پھنس گئے ہیں۔ پھر ایسا لگا کہ بس نے سطح زمین کو چھوڑ دیا اور یہ گھوم رہی ہے۔ ہمیں ایک چکر سا آیا اور متلی سی محسوس ہوئی میں اسی لئے ہنڈولوں میں نہیں بیٹھتا۔ دراصل بس نہیں بلکہ پوری سرنگ گھوم رہی تھی اور چکر ہمیں آ رہا تھا۔ یہ سرنگ سکس ملین ڈالر مین کی کہانی Big Foot میں دکھائی جا چکی ہے۔ اس تکنیک کو Spinning Vortex of Sight کہتے ہیں۔

ہمارا ٹور آدھا ہو چکا تھا۔ اب بس کے بجائے کچھ اسٹیج شو رہ گئے تھے اس لئے پروگرام کا انٹرویل اناؤنس ہوا اور ہمیں پروپ پلازا میں چھوڑ دیا گیا۔ یہاں وقفے کے دوران کچھ آرام اور کھانے پینے کا انتظام تھا۔ آئس کریم، کولڈ ڈرنک، ہاٹ ڈاگ، سینڈوچ، پنیرا اور مختلف برگر بک رہے تھے۔ ہم نے بھی پنیرا اور پیپسی لیا اور ایک کرسی پر جم کر گئے۔ قریب ہی ایک آبشار کی رم جھم کانوں میں رس گھولنے لگی۔ سامنے بہت سارے ماڈل کھڑے تھے جن کے ساتھ سیاح تصویریں اتروا رہے تھے۔ قریب ہی ایک بہت بڑا ٹیلی فون نصب تھا۔ اس سے کچھ دور دس فٹ اونچے ایک ہاتھ نے ایک قد آدم لپ اسٹک تھام رکھا تھا۔ پتہ نہیں یہ کسی کاسمیٹک کمپنی کا اشتہار تھا یا کوئی بھونڈا اسمبل۔ ان دنوں مغرب میں عورتوں اور ان کی زیبائش کے سامانوں کو عجیب عجیب انداز میں سرِ راہ لایا جا رہا ہے۔ ان ماڈل کو The Incredible Shrinking Woman نامی فلم اور مشہور ٹی وی سیریل Land of the Giants میں دکھایا گیا ہے۔ یہاں ایک بڑی رولس رائس کار بھی کھڑی ہے۔ ساتھ ہی ٹی وی شو A Team کی وین بھی کھڑی ہے جسے مسٹر ٹی اپنے ہاتھوں سے اٹھا لیتا ہے۔ اسے کچھ لڑکیاں بھی اٹھا اٹھا کر دیکھ رہی تھیں۔ پتہ نہیں یہ گاڑی کتنی ہلکی تھی یا اس میں بھی کوئی چکر تھا۔

اب ہمیں چند اسٹیج شو دکھائے گئے۔ سب سے پہلے ہمیں Six Points دکھایا گیا۔ یہ ایک تاریخی مقام ہے۔ یہیں سب سے پہلے کاؤبوائے فلم Cow Boy کی شوٹنگ ہوئی۔ ماحول پرانے ٹیکساس کا تھا۔ کچھ ایکسٹرا ہیٹ اور گن لئے ٹہل رہے تھے۔ یہاں ایک وقت میں ایک ساتھ چھ مختلف فلموں کی شوٹنگ ہوتی ہے۔ my Little Chikadee کی شوٹنگ اسی جگہ کی ہے۔ وقت گزرتا گیا۔ اس دھول گرد والے سیٹ اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ میں شوٹنگ چلتی رہی۔ ان راستوں پر نشانہ بازی اور گھوڑ سواری کے کرتب جان وین، جیمس اسٹیوارٹ، ٹام مکس، اینڈی ڈیوائن اور کلنٹ ایسٹ ووڈ جیسے فلمی ستارے کرتے رہے ہیں اور یہ لوگ اسٹنٹ فلموں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ گائیڈ سے پتہ چلا کہ آج یہاں کسی فلم کی شوٹنگ میں Edie Murphy حصہ لینے والا ہے۔ یہ سن کر کچھ لوگ مچل گئے کہ ہم مرفی سے مل کر آٹوگراف لیں گے۔ کچھ لوگوں کو چھوڑ کر ہم آگے بڑھے۔ سامنے Simmone & Simon, A team اور Knight Rider کے سیٹ لگے ہوئے تھے۔ ان ٹی وی سیریل کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ آج کل فلم کی جگہ ٹی وی نے لے لی ہے۔ اس نے فلمی صنعت کو متاثر کیا ہے۔

دوسرا شو بھی مار دھاڑ والا تھا جس میں باقاعدہ ایک سوانگ دکھایا گیا۔ کھلے میدان میں ایک مکان، ایک ہوٹل اور سیلون کا سیٹ لگا ہے۔ اچانک ایک کاؤبوائے ہوٹل سے نکل کر بھاگتا ہے۔ اس کے پیچھے دو غنڈے لگے ہوئے ہیں۔ یہ ہالی ووڈ کے بہترین اسٹنٹ مین ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف مار دھاڑ کرتے ہیں بلکہ فائرنگ، چھرازنی اور تیس فٹ کی بلندی سے کودتے بھی ہیں۔ پندرہ منٹ کے اس اسٹنٹ شو کو کوکا کولا کمپنی نے اسپانسر کیا تھا۔

اب ہمیں ایک ہال میں اسٹیج شو The Adventure of Conan دکھایا گیا۔ یہ طلسماتی شو بھی مار دھاڑ کا تھا مگر اس کا سیٹ الف لیلوی تھا جس میں سینگ والے شیطان نما انسان، جادوگر اور سچ مچ کے آگ کے شعلے پھنکارتا ڈراگون بھی تھا۔ اس خوفناک ڈراگون کے مندر میں ہیرو کونان کی محبوبہ سونجا قید ہے۔ بس اسے چھڑانے جو جاتا ہے پتھر کا ہو جاتا ہے۔ ہیرو صاحب تلوار میں ماہر ہیں اور ہر قیمت پر لڑ مر کر سونجا کو بچا لیتے ہیں۔ تھیم بڑی فرسودہ تھی مگر میرے ساتھ ہر کسی نے اس شو کو اس لئے پسند نہیں کیا کہ الف لیلوی فلم سب نے دیکھ رکھی تھی مگر اسٹیج پر جادوگری کا یہ ڈرامہ صرف یونیورسل میں ممکن تھا۔ اس پر جوش شو میں مار دھاڑ اور لائٹ اور ساؤنڈ کے علاوہ اسپیشل ایفیکٹ لیزر ٹکنالوجی کا کمال تھا۔

اس کے بعد Animal Actor's Stage دیکھنے کی باری تھی۔ یہ شو بھی بہت مقبول ہے۔ اس میں جانور اور پرندے اداکاری کر کے دکھاتے ہیں۔ ان میں کتا، بلی، بندر، طوطا اور عقاب شامل ہیں۔ یہ وہ فن کار ہیں جو نہ ہزاروں ڈالر ڈیمانڈ کرتے ہیں نہ ہی انہیں الگ میک اپ روم یا ڈریسنگ روم کی ضرورت پڑتی ہے نہ ہی کسی پروپگنڈا کے شکار ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ موڈ خراب ہو جانے پر یہ بھی ڈائرکٹر کے لئے دردِ سر بن جاتے ہیں۔ اس شو کو بچوں نے بہت پسند کیا تھا۔

اس کے بعد Screen test comedy theatre تھا۔ یہاں سیاحوں میں سے چھ جوان لڑکے اور لڑکیوں کو چن کر انہیں اسی وقت فلم میں کام کرنے کا آفر دیا گیا۔ یہ مہمان اداکار خوشی خوشی اسٹیج پر گئے۔ سیٹ تیار تھا۔ سین سمجھا گیا اور کیمرہ آن ہو گیا۔ بینک لوٹنے سے لیکر گھوڑے پر تعاقب، سمندر میں چھلانگ اور جہاز سے فرار اور مار پیٹ بھی شامل تھی۔ ہاں بینک نقلی، گھوڑے پلاسٹک والے صرف آدھے، چھلانگ شیشے کے ایک ٹب میں اور جہاز لکڑی کا تھا۔ ان مناظر کو ویڈیو کے ذریعہ بنی بنائی ریڈی اسٹاک فلم کے منظروں میں ملا دیا گیا۔ اور تیس منٹ میں ایک کامیڈی تیار تھی۔ پورا مجمع ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی یہاں مہمان اداکاروں میں سے کسی کو بریک بھی مل جاتی ہے۔ گائیڈ نے اس سلسلے میں سارہ مائلز کا نام بتایا جو یہاں چائلڈ آرٹسٹ کے طور پر منتخب ہوئی تھی اور آج مصروف ترین اداکارہ ہے۔ اس شو میں روزانہ کئی اداکار اپنی قسمت آزمانے آتے ہیں۔



http://www.kitaabghar.com
urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہاں عشرتوں کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

آج City of Angles (جو عام اصطلاع میں لاس اینجلز کو کہا جاتا ہے) کی آبادی ۵۰ لاکھ ہے جس میں پندرہ لاکھ غیر قانونی مہاجر ہیں۔ اس آبادی میں سب سے زیادہ یہودی پھر Oriental جس میں چینی، کورین، جاپانی اور انڈو پاکستانی آباد ہیں۔ اس کے بعد میک سیکی اور ہسپانوی آبادی ہے۔ اس شہر میں تقریباً اسی زبانیں روزمرہ کے استعمال میں ہیں۔ کبھی یہ شہر ہسپانوی کالونی تھا مگر ۱۸۴۷ء میں اسے میکسیکو سے خرید لیا گیا۔ ۴۶۳ اسکوائر میل پر پھیلے ریگستانی، پہاڑی اور ساحلی علاقے کو قدرت نے بہت زرخیزی عطا کی ہے۔ چمکتے سورج اور معتدل آب و ہوا نے یہاں کے موسم کو بہت خوشگوار کر دیا ہے۔

ہم نے ٹورسٹ بس پکڑی اور سیدھا ہالی وڈ بلوارڈ پر مشہور چائینز تھیٹر پہنچے۔ یہ فلم ہال سے زیادہ چینی مندر یا پگوڈا لگ رہا تھا۔ اس فلم میں Terms of Endearment چل رہی تھی۔ مگر ہم فلم دیکھنے نہیں صرف تھیٹر کے آنگن کو دیکھنے آئے تھے۔ میں نے کیا آپ نے بھی آٹو گراف یا دستخط کا عکس کاغذ پر دیکھا ہوگا مگر یہاں ہالی ووڈ کے ہر دلعزیز فلمی ستاروں کے دستخط فرش پر کندہ تھے اور لوگ جھک جھک کر ان کے ساتھ تصویریں اتروا رہے تھے۔ قصہ یوں ہے کہ تھیٹر کا مالک گرا ہم جب تھیٹر کا فرش ٹھیک کر رہا تھا تو اس کا ایک مشہور فلم اسٹار دوست ملنے آیا اور کچی سمنٹ پر اس کا پاؤں پڑ گیا۔ یہیں گر ہم کے کاروباری ذہن نے سوچا کیوں نہ مشہور فلمی ستاروں کے دستخط سمنٹ پر منقش کر دیئے جائیں اور تھیٹر کو سیاحوں اور عوام کی توجہ کا مرکز بنا دیا جائے۔ بس میرلن منرو، صوفیہ لارین، چارلسٹن ہسٹن، راک ہڈسن، الزبیتھ ٹیلز، رچرڈ برٹن وغیرہ کے دستخط آج سیاحوں کو دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔ فلمی ستاروں کی شہرت و مقبولیت کو ہر کوئی حسرت سے دیکھتا ہے مگر پتہ نہیں کیوں ان آٹو گراف کو پاؤں تلے دیکھ کر ان کی پستی کا احساس ہوا۔

سامنے فٹ پر ہمالیہ انڈیا ریسٹورنٹ کا بورڈ لگا تھا۔ ساتھ ہی لکھا تھا پانچ ڈالر میں بوفٹ لنچ - جتنا کھا سکتے ہو کھاؤ مگر اس وقت بھوک بھی نہیں تھی اور آج ہم میکسیکن فوڈ کھانے کے موڈ میں تھے۔

جس طرح نیویارک میں مختلف قومیت کے لوگوں نے اپنے علاقے چن رکھے ہیں اسی طرح ایل اے میں بھی چائنا ٹاؤن آباد ہے جسے میں نے نہیں دیکھا کہ نیویارک سا ہوگا مگر سان پیدرو پر آباد لٹل ٹوکیو نے جاپانی جھنڈیاں، قمچیاں اور ملبوسات اور جاپانی فوڈ لئے مغرب میں مشرق کا ماحول پیدا کر دیا ہے۔ یہیں ان لوگوں نے جیپنیز ویلیج پلازا کھول کر اپنی ثقافت اور کاروبار کو چاند چاند لگا لیا ہے۔ مجھے یہ چائنا ٹاؤن سے زیادہ صاف ستھرا اور اچھا لگا مگر ان کا کھانا ایک بار کھانے کی کوشش کی تھی، بس .... ہاں اس کھانے کی سجاوٹ اور خوبصورتی میں جتنی محنت کی گئی تھی کاش اسے اتنی ہی لگن سے پکایا بھی جاتا۔ یہاں تانا بانا تہوار جو عاشقوں کے لئے ہے بہت دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔

کچھ فاصلے پر الویرا اسٹریٹ تھی جو میکسیکن یا ہسپانوی علاقہ ہے۔ یہاں کی فضا لاطینی امریکہ کی بو باس لئے ہوئے ہے۔ اس علاقہ کو شہر لاس اینجلز کی جائے پیدا کہا جاتا ہے۔ یہاں لوگ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول رہے تھے۔ ہسپانوی یا میکسیکن کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ اس نے اپنی خو نہیں بدلی ہے۔ آج بھی وہ اسپینش بولتا ہے۔ ایک تو انگلش میں دلچسپی نہیں لیتا دوسرے اس میں بات چیت کو اپنی توہین سمجھتا ہے۔ یہ دراصل اس کی احساس کمتری ہے مگر اپنی عورتوں کو خوب ماڈرن بننے کی اجازت دیتا ہے۔ یہاں لڑکیوں کو ان کے روایتی گھاگرا نما اسکرٹ میں مٹکتے دیکھا۔ ان کے

بازار میں بڑے ہیٹ سے لے کر چمڑے کی مصنوعات اور دستکاری کے نمونے بھرے پڑے تھے۔ گھوم پھر کر میں ایک میکسیکن ریستوران میں داخل ہوا۔ دیواروں پر بیٹاڈ ورا اور بلفائٹنگ کی عکاسی کی گئی تھی۔ میں نے مینو دیکھ کر ایک امپاناڈا کا آرڈر دیا۔ ویٹر کچھ ہی دیر میں ایک سموسہ نما چیز لے آیا۔ میں جو سمجھ رہا تھا وہ یہ نہیں تھا۔ میں نے ویٹر سے سب سے اچھی ڈش کا نام پوچھا اس نے کہا ''ٹاکو'' .... یہ چپاتی کے رول کے اندر پتہ نہیں کیا کیا بھرا تھا مگر مرچ اتنی تھی کہ بس رو دیا۔ ویٹر کو آئس کریم اور بل ساتھ لانے کو کہا۔ ٹھنڈی آئس کریم نے منہ کو ٹھنڈا کیا اور میرے میکسیکن فوڈ کا بھوت اتر چکا تھا۔

اب ہم Paramonunt Pic کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ آج یہاں ٹی وی شو سالڈ گولڈ اور فیملی ٹائیز کی شوٹنگ چل رہی تھی مگر یہاں رکے نہیں۔ بس ایچ ڈبلیو میموریل پارک کے پاس سے گزری تو گائیڈ نے بتایا کہ یہ خوبصورت پارک یہاں کا پرانا قبرستان ہے۔ چارلی چپلن کی قبر یہیں ہے۔ ہم رسل اسٹریٹ سے ہوتے ہوئے ایک پہاڑی پر جا رہے تھے۔ پورا علاقہ ہرا بھرا اور خوبصورت تھا۔ یہ فیرمانٹ کا علاقہ تھا۔ یہیں مشہور باکسر محمد علی کلے رہتا ہے۔

بیورلی ہل کے علاقے میں ہالی ووڈ کے فلمی ستارے رہتے ہیں یہاں مکانات ملین ڈالر سے کم کے نہیں۔ اب فلمی ستارے مالی بو کے علاقے میں شفٹ ہو رہے ہیں اور یہاں عربی، جاپانی اور دیگر دولت مند رہنے لگے ہیں۔ یہاں دولت بہتی ہے۔ لوگ خرچ کرنے کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ Bentleys- Rolls, Jaguars گاڑیاں لائن سے کھڑی تھیں۔ یہاں فیشن زدہ اور نئے فیشن ڈیزائنر بھٹکتے ملتے ہیں۔ دنیا کے سب سے مہنگے اسٹور یہاں ہیں جن میں Tiffany, Gucci اور Georgio میں ایک رومال تین ہزار ڈالر کا لگا تھا۔ اس سے سوٹ کی قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پتہ نہیں اتنی مہنگی چیز خاص کر رومال کون خریدتا ہے؟

کچھ فاصلے پر کیپیٹل ریکارڈس کی بلڈنگ تھی اور اسکے بعد Hollywood Bowl تھا۔ پہاڑی کے بیچ ایک پیالے کی شکل کا اسٹیڈیم نما یہ اپنے طرز کا واحد ایمفی تھیٹر ہے اس میں ۱۷۰۰۰ سیٹ کی گنجائش ہے۔ ۱۹۲۲ء میں اس کی بنیاد ڈالی گئی اور ۱۹۲۹ سے یہاں موسم گرما میں کھلے آسمانوں کے نیچے ستاروں بھری شام میں موسیقی اور راگ ورنگ کا زبردست پروگرام رہتا ہے۔ ان دنوں اس فلہارمونک کا کنڈکٹر آندرے پریون ہے۔ ہم واپس وائن ایونیو پر آئے۔ فلم After Hours چل رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر ایک عمارت نظر آئی۔ پتہ چلا یہ مشہور کاسمیٹک کمپنی Max Factor کا میوزیم ہے۔ امریکہ اور یورپ میں میوزیم بنانے کا بہانہ ڈھونڈا جاتا ہے۔ اب بھلا لپ اسٹک اور غازے کے عجائب گھر کی بھی کوئی تک ہے۔ ایل اے میں ایک اور مشہور عجائب خانہ La Brea Tar Pits ہے۔ اس کے بارے میں دلچسپ معلومات حاصل ہوئیں۔ ۱۷۶۹ء میں ولشائر بلوارڈ کے ایک پارک میں چالیس ہزار سال قبل کے ڈھانچے اور معدنی و جماداتی ذخیرے دریافت ہوئے۔ انہیں جارج سی پیج نامی شخص نے اسی مقام پر ایک عجائب گھر بنا کر محفوظ کر لیا۔ آج بھی اس پارک میں کچھ گڑھوں میں گرم گرم لاوا اور تارکول ابلتا نظر آتا ہے۔

ایل اے کی تیز رفتاری میں فری وے کا بہت دخل ہے۔ امریکہ کے دوسرے شہروں میں ایسے راستوں کو ہائی وے کہتے ہیں۔ ایل اے میں چار خاص فری وے ہیں جو گنجان آبادی سے نکل کر آزاد راستوں پر آ جاتے ہیں۔ یہاں کی تیز رفتاری مت پوچھئے۔ ان راستوں پر نہ ٹریفک لائٹ ہوتی ہے نہ کوئی رکاوٹ نہ ہی ٹریفک جام مگر ان راستوں پر بے خطر گاڑی دوڑانے والے کبھی کبھی بہت سنگین حرکتیں کرتے ہیں خاص کر صبح فری وے پر ڈرائیور حضرات کو اسٹیئرنگ پر اخبار رکھے پڑھتے اور اونگھتے دیکھا۔ جوانوں کو بیئر سے شغل کرتے اور عورتوں کو سوئٹر بنتے مگر یہ آزاد ڈرائیور پولس کی نظر میں آتے ہی فائن یا چالان کر دیئے جاتے ہیں۔ شہر کی بھیڑ سے نکل کر مضافات جانے کے لئے فری وے بڑا سہل رابطہ ہے۔

ہم ہاربر فری وے سے ہوتے ہوئے سن سیٹ بلوارڈ پہنچے۔ ہالی ووڈ اور بیورلی ہل کے درمیان دو میل تک پھیلے سن سیٹ اسٹرپ کا اپنا مزاج ہے۔ یہاں پورے ایل اے کی کثافت جمع ہے مگر جگ مگ کرتے نائٹ کلبوں اور ریستورانوں میں ہر وہ شغل ممکن ہے جو ایل اے کے دوسرے علاقے میں ممکن نہیں۔ ایل اے میں عریانیت اور مساج پارلر اور نائٹ کلبوں کی اجازت نہیں مگر سن سیٹ اسٹرپ پر کھلی چھوٹ ہے۔ دنیا کے امراء و

شرفا بڑی معصومیت سے یہاں دادِعیش دیتے ہیں۔ جہاں پیسہ ہوگا وہیں حسن اور جرائم پیشہ لوگ بھی گھومتے نظر آئیں گے۔

ایک ریکارڈ کے مطابق یہاں ایک دن میں انیس بینک لوٹے جا چکے ہیں۔ دولت کی ریل پیل میں مہنگے سے مہنگے اسٹور اور ریستوران اس علاقے میں بکثرت ہیں۔ یہیں Aware Inn نامی ریستوران ہے۔ فلمی اداکارہ گلوریا سوانسن اور گریٹا گاربو یہیں ڈائٹ فوڈ کھاتی ہیں۔ ایک اور ریستوران Scandia میں بھی جانی پہچانی فلمی شخصیتیں حاضری دیتی رہی ہیں۔ قریب ہی سن سیٹ موٹل ہے جہاں پورے امریکہ سے بھاگے ہوئے جوان لڑکے اور لڑکیاں پناہ لیتی ہیں اور کچھ ہی دور ایک گلابی مکان نظر آیا جو ڈائرکٹرس گلڈ آف امریکہ ہے۔ اس مکان کے آس پاس خوبصورت لڑکیاں اور خوبرو لڑکے سلور اسکرین پر چمکنے کے لئے منڈلاتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر لڑکیاں اس علاقے کے مساج پارلر اور بیوٹی شوکیس کے دلدل کا شکار بنتی ہیں اور صحت مند اور خوبرو جوان یا تو ریستورانوں میں ویٹر بنتے ہیں یا قسمت نے ساتھ دیا تو قریبی Play boy Club کے ڈانس فلور پر مٹک مٹک کر کاک ٹیل ویٹر بن جاتے ہیں۔

ان ہی شاہراہوں پر سے ہوتے ہوئے فلمی ستارے شہرت کی بلندیوں کو چھوتے ہیں یا پھر اکسٹرا بن کر گمنامی کے اندھیروں میں گم ہوجاتے ہیں۔ سیکس نے اب نہ صرف ہالی ووڈ بلکہ پورے امریکہ کے ذہنوں کو ''نئی پرواز'' عطا کر دی ہے۔ فری سیکس کی اس سوسائٹی میں اب مرد اور عورت کے روایتی کردار اور محبت رفتہ رفتہ ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ مرد عورتوں سے بیزار اور عورتیں مردوں سے ناخوش۔ یہی علاقہ GAY لوگوں کے لئے مشہور ہے۔ پورے امریکہ میں سب سے زیادہ خواجہ سرا کیلی فورنیا اور پھر اس علاقے میں ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بڑے بڑے ذہین لوگ، ڈاکٹر سے لے کر فلم اسٹار تک اس نفسیاتی مرض کے شکار ہیں۔ عورتیں بھی کچھ کم نہیں۔ انہوں نے بھی ''خود کفیل'' ہونا سیکھ لیا ہے۔

سن سیٹ بلوارڈ نہ صرف بہت مہنگا علاقہ ہے بلکہ اپنے سینے میں رومان پرور اسکینڈل کی بہت سی داستانیں سمیٹے ہوئے ہے۔ لزٹیلر کے عشق کے قصے اور قیاس آرائیاں کہ اس کا ساتواں شوہر کون ہوگا۔ کلنٹ ایسٹ ووڈ کی فلم ہٹ ہوگی کہ نہیں اور اس بار آسکر اکیڈمی ایوارڈ کون کون لے جائے گا۔

آسکر ایوارڈ کی شروعات ۱۹۶۷ میں ہوئی مگر پہلی مرتبہ ۱۹۳۲ میں یہ انعام چارلس لاٹن کو فلم ''پرائیوٹ لائف آف ہنری ایٹھ'' میں ملا۔ ابھی پچھلے دنوں ۱۹۸۲ میں بین کنگسلے کو فلم ''گاندھی'' میں اس انعام سے نوازا گیا ہے۔ ٹینا ٹرنر کے بعد اب ماڈونا اپنی خوبصورتی اور جسم کے سیکسی نقوش کے تیر تلوار لئے پورے آب و تاب کے ساتھ گا رہی ہے بلکہ ناچتی ہے اور پورے ہالی ووڈ کو نچا رہی ہے۔ مائیکل جیکسن ایک پرشور آندھی کی طرح آکر چھا گیا پھر رفتہ رفتہ اس کی آواز کا مطلع صاف ہو رہا ہے۔ ہالی ووڈ کے سنگر ہمارے دیسی فنکاروں کی طرح نہیں کہ مرنے سے پہلے مائیک نہیں چھوڑیں گے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ مائیک انہیں چھوڑ دے۔ یہاں دو ایک ریکارڈ سے اتنے پیسے مل جاتے ہیں کہ ساری زندگی سن سیٹ پر پڑے رہیں، کیا فکر ہے۔ مگر کچھ سنگر ہیں جیسے فرینک سناٹرا، وہ جب بھی ''نیویارک۔ دی سٹی دیٹ نیور سلیپ'' گاتا ہے تو سننے والا بس سنتا جائے۔ رومانی نغمے اس کی طرح لوگ کم گاتے ہیں مگر آج کل نابینا اسٹیوی وانڈر اور لائنل رچی کا زمانہ ہے۔ یہاں سنگر نہ صرف گاتے ہیں بلکہ شاعری بھی کرتے ہیں اور موسیقی کی ترتیب بھی خود دیتے ہیں۔ کچھ سنگر جیسے فرینک سناٹرا اور باربرا اسٹرایسنڈ نہ صرف رومانی گیت گاتے ہیں بلکہ جم کر اداکاری بھی کرتے ہیں۔

رفتہ رفتہ سن سیٹ بلوارڈ کے راز مجھ پر افشا ہو رہے تھے کہ عشرتوں کے اس دیار میں ایک نیون سائن پر نظر رک گئی۔ یہ کوئی دارالمغرب نامی ریستوران تھا۔ ہم کشاں کشاں اس میں جانے سے خود کو روک نہ سکے۔ آخر کچھ تو کرنا تھا۔ حسن و عشق کے کوچے میں جیسا کہ نام سے ظاہر تھا یہ ایک مراکشی ریستوران نکلا۔ ایسا لگا کہ ہم مراکش کے کسی سلطان کے یہاں مدعو ہیں۔ دبیز قالین، منقش درودیوار اور صحت مند نوعمر لڑکے ترکی ٹوپی اور بغدادی ملبوسات میں مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ مجھے بھی ایک دلکش کمرے میں لے جایا گیا۔ میز کرسیوں کی جگہ مسند اور گاؤ تکیوں کا اہتمام تھا۔ دیواروں پر عربی موسیقی کے ساز و سامان سجے تھے۔ چھت پر چوبی نقش و مینا کاری اور جلترنگ سے بج اٹھنے والے جھاڑ فانوس آویزاں

تھے۔میں اس الف لیلوی دربار میں کھویا ہوا تھا کہ ایک لڑکا چلمچی اور اگلدان لے کر حاضر ہوا اور ہاتھ دھلانے کی رسم ادا کی گئی۔ساتھ ہی ایک دوسرا لڑکا چاندی کی کیتلی میں سادہ چائے لے کر آ گیا۔اس نے جام نما پیالے میں چائے اس انداز سے انڈیلی جیسے ہمارے یہاں لسی والے ایک گز لمبی لسی پھینٹتے ہیں۔۔چائے کا پہلا گھونٹ اترا تھا کہ سامنے ایک دوشیزہ نے جھک کر آداب کیا اور مصری بیلی رقص کرنے لگی۔بہت دھیمی موسیقی پر اس رقص کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ہم رقص میں کھوئے ہوئے تھے کہ ویٹر نے آ کر کھانے کا پوچھا۔اتنی دیر میں ہم کہاں سے کہاں پہنچ چکے تھے اور یہ بھول ہی گئے تھے کہ ہم کھانا کھانے آئے تھے۔ہم نے ویٹر سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑایا کہ کچھ بھی لے آؤ اور پھر رنگ و رامش میں کھو گئے۔ویٹر کچھ ہی دیر میں ایک طشت رکھ گیا جس میں خشک میوے قرینے سے رکھے تھے۔ساتھ ہی ایک طشت میں پھل تھے۔رقاصہ جس کا نام فیروزہ تھا کچھ ایسے رقص کر رہی تھی جیسے قدرت نے اسے رقص کے ذریعہ ہی خدمت خلق کی ہدایت دی ہے۔اس وقت جوشؔ مرحوم بہت یاد آئے۔انہوں نے سو فیصد ٹھیک کہا تھا کہ ''رقص اعضا کی شاعری ہے''۔مزے کی بات یہ تھی کہ ہر کسی کو یہ خوش فہمی تھی کہ یہ شاعری محض اس لئے کی جا رہی ہے میں پوری توجہ سے رقص میں کھونے کے باوجود پوری طشت کے خشک میوے ختم کر چکا تھا اور چائے تو پتہ نہیں کب کی پی لی تھی۔

مسکراتے ہوئے ویٹر نے مراکش کی نعمت میرے سامنے چن دی۔مجھے بتایا گیا کہ B'stilla نامی اس پکوان میں بھنے ہوئے بیٹر کو انڈے اور بادام سے لپیٹ کر مکھن،چینی اور دار چینی کے سفوف کا چھڑکاؤ کیا گیا ہے۔واقعی یہ ڈش بڑے مزے کی تھی۔ساتھ میں سلاد اور بڑے مٹر کا سوپ تھا۔ویٹر نے مزید بتایا کہ یہی ''بستیلا'' ڈش کبوتر،مرغی اور خرگوش کے گوشت سے بھی تیار کی جاتی ہے۔میں نے فوراً پوچھا کہ ابھی میں نے جو کھانا کھایا وہ کس کا گوشت تھا۔پتہ چلا کہ بٹیر۔ورنہ ابھی کرکری ہو جاتی۔حیرت تھی کہ یہ دلکش ریستوران بہت مہنگا نہیں تھا۔چالیس ڈالر کا بل ادا کر کے میں بڑے شاہی انداز سے باہر نکلا۔

اب تک کے سفر میں اس سے عمدہ عیاشی یا تفریح میں نے نہیں کی تھی۔سن سیٹ بلوارڈ کی حشر سامانیوں نے اتنا خوش نہیں کیا تھا جتنا دار المغرب کے ماحول،کھانے اور رقص نے سرور بخشا تھا۔اگر آپ ہالی ووڈ جائیں تو لز ٹیلر اور صوفیہ لورین کے چکر میں پڑنے کے بجائے دار المغرب ضرور جائیں۔سن سیٹ بلوارڈ دولت اور شہرت کا سراب ہے مگر دار المغرب ایک پرسکون نخلستان ہے۔



چل دانش گھر آپنے

شان قلندری کے ساتھ میری آوارگی کی آخری شب تھی، سردی ایسی کہ ایک دن اور رکتا تو قلفی بن کر رہ جاتا۔ میں نے اپنا رختِ سفر باندھنا شروع کیا۔ دوسرے دن سلطنتِ انگلشیہ کو شاہی سلامی مارتا میں ہیتھ رو ایئر پورٹ پر بیٹھا لندن کی سردی کا آخری مزہ لے رہا تھا، اتنے میں چیک اِن (Checkin) پر ایک پنجابی محترمہ نمودار ہوئیں۔ لوگ قطار میں کھڑے ہونے لگے۔ میں بھی خاصا قلی بنا دو سوٹ کیس، ایک بریف کیس، ایک ٹورسٹ بیگ اور ایک بستر نما سوٹ کو ایک چھوٹی ٹرالی پر لاد کر سامنے بڑھا۔ جب میں نے وزن کرنے کی مشین پر اپنے گناہوں کے بوجھ کو ٹپکا تو محترمہ کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ پتہ چلا کہ بیس کیلو کی اجازت ہے اور میں نے پلڑے ہر ساٹھ کیلو رکھ دیا تھا۔ محترمہ نے مسکراتے ہوئے کہا میں صرف چالیس کیلو زیادہ لے جا رہا ہوں اور اس کی ڈیوٹی سولہ ڈالر فی کیلو کے حساب سے ادا کرنا ہوگی۔ میں بچپن سے حساب میں کمزور ہوں مگر اس وقت فوراً اندازہ ہوا کہ تقریباً ایک ماہ تو لندن ہوائی اڈے پر جھاڑو لگانا ہوگی شاید تب یہ رقم جمع ہو سکے گی کیونکہ اب تک میری جیب بالکل ہلکی ہو چکی تھی۔ مجھ سے غلطی ہو چکی تھی۔ دراصل امریکہ سے چلتے وقت ستر کیلو وزن کی اجازت تو ظالموں نے دی ہے مگر ساتھ ہی یہ بندش بھی ہے کہ رستے میں کہیں رکنے سے صرف بیس کلو کی اجازت ملے گی۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی میں پتہ نہیں کس طرح یہ حماقت کر بیٹھا تھا۔ شدید سردی میں بھی پسینے چھوٹ گئے۔

خیر میری مسکین صورت اور رفیوجی داڑھی پر محترمہ کو پتہ نہیں کیسے رحم آ گیا۔ کچھ سوچ کر انہوں نے کہا کہ آپ رک جائیں میں کوئی صورت نکالتی ہوں! میں قطار سے الگ ہو گیا۔ بہت سنجیدگی سے وزن کم کرنے کے متعلق سوچا۔ روپئے میں دس آنے تو میرے سوٹ کیس میں کتابیں تھیں۔ کتابیں کم قیمت پر خریدنا، جمع کرنا اور نہ پڑھنا میری خاندانی ہابی (Hobby) ہے۔ میری اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ تر دوستوں نے تحفے میں کتابیں تھما دی تھیں۔ میں نے خود ڈھونڈ ڈھونڈ کر سیل سے انسائیکلو پیڈیا کا پورا سیٹ خرید لیا تھا۔ ایک ساتھی نے دو بڑی ضخیم کتابیں ''ہسٹری آف انگلش ڈرامہ'' اور ''ہسٹری آف انگلش لٹریچر'' پیش کی تھیں۔ یہ دو کتابیں ہی تقریباً پانچ سات کیلو کی تھیں۔ اچانک میرے پراگندہ ذہن میں ایک بات آئی۔ میں نے بیگ سے دونوں جلدی نکالیں اور ٹہلتا ہوا ایک خالی کاؤنٹر پر جا کھڑا ہوا۔

کتابیں کاؤنٹر پر چھوڑ کر ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی بھی میری طرف متوجہ نہ تھا۔ بھیڑ صرف ایئر انڈیا کے کاؤنٹر پر تھی۔ جب میں مطمئن ہو گیا کہ میں نے وزن ہلکا کر لیا تو خراماں خراماں اپنی لائن پر واپس آ گیا۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ رفقاء نے جو تحائف دیئے ہیں انہیں کس طرح کم کروں۔ ایک صاحب نے آ کر بڑی متانت سے کہا ''سر! آپ اپنی کتابیں وہاں چھوڑ آئے تھے یہ لیجئے۔'' میری بوکھلاہٹ قابل دید تھی۔ شامت اعمال ما صورتِ کتب گرفت'' مرتا کیا نہ کرتا۔ شکریہ کہہ کر وہ بوجھ واپس لیا اور بیگ میں ٹھونس لیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کتابیں میرا پیچھا نہ چھوڑیں گی۔ مجھے ہندستان کے اسٹیشن اور ہوائی اڈے بری طرح یاد آئے کہ آپ کا سامان زیادہ نہ ہو، یہ آپ کے فکر کرنے سے پہلے کم ہو جاتے ہیں! ہائے فرنگیوں کی دیانت داری مجھے لے ڈوبے گی۔ پتہ چلا ہر کونے پر کلوز سرکٹ کیمرے لگے ہوئے ہیں جنہوں نے میری چغلی کر دی اور کنٹرول روم سے وہ حضرت آ کر مجھے دوبارہ بھاری کر گئے۔

پتہ نہیں کون سی نیکی کام آ گئی کہ محترمہ نے ایک نیک صفت ایئر ہوسٹس سے کہہ کر میرا آدھا بوجھ اسٹاف کے نام پر بک کر دیا اور میری جان

میں جان آئی۔ میں نے جاپانی انداز میں جھک کر شکریہ ادا کیا اور ہینڈ بیگ وغیرہ سمیٹے ہوئے جہاز راجندر چولا کی طرف لپکا۔ جہاز کے کھلے پٹ ممتا کی سی بانہیں پھیلائے اپنے سینے میں چھپا لینے کو تیار ملے۔

آج صبح پتہ نہیں کس بھلے مانس کا منہ دیکھا تھا کہ سب مشکلیں آسان ہو رہی تھیں۔ جو بچی استقبالیہ کے لئے کھڑی تھی وہ بھی قاعدے کی تھی۔ مسکراہٹ میں تازگی، شاید نئی تھی، میں نے سیٹ پر بیٹھتے ہی خدا کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے جھانک کر شیشے کے باہر دیکھا۔ فضا ابر آلود تھی۔

اے مغرب کے میز بانو! الوداع! پیرس کے کوچو، فرینکفرٹ کے کلیساؤ، کوپن ہیگن کی شاہراہو، لندن کی گلیو، نیویارک کی فلک بوس عمارتو، وہائٹ ہاؤس کے باسیو، ایل اے کے میز بانوں، مشینو، سبزہ زارو، بازارو، مینارو الوداع ——

ایک گڑگڑاہٹ ہوئی اور اس سے پہلے کہ میں مزید قصیدہ خوانی کرتا جہاز فضا میں تیر رہا تھا۔ ایک کھنکتی ہوئی آواز جہاز میں گونجی "کیپٹن شرما اور ایئر انڈیا کی اور سے ہم آپ کا سواگت کرتے ہیں۔" اس کے بعد میں نے آنکھیں بند کرلیں اور ہیڈ فون سے چینل ۱۰ پر غزلیں سننے لگا۔

طلعت عزیز کی سریلی آواز لوری کا کام کر رہی تھی۔ غزل پیاری تھی :

"آپ کا حسن جو دیکھا تو خدا یاد آیا"

اچانک کچھ کھٹ پٹ ہوئی۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک بھاری بھر کم تانبے کی طرح تپی ہوئی ایئر ہوسٹس ناشتے کی ٹرے پٹخ کر زبردستی کا لکیٹ کا اشتہار دے رہی تھی۔ واہ رے مالک تو بھی کیسی کیسی غزلیں لکھ دیتا ہے —— سبحان اللہ!

میں نے محترمہ سے کہا یہ ٹرے آپ لے جائیں اور مجھے قوشر Kosher یعنی یہودی طرز کے ذبیحہ کا پکوان لا دیں۔ ان کے بے رنگ چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے۔ وہ مجبوراً حکم کی تعمیل کی غرض سے ٹرے اٹھا کر چل پڑیں۔ میں ہوائی سفر میں قوشر کھانوں کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس میں حرام حلال کا شک نہیں رہتا۔ کھانے کے ساتھ یہودی راہبوں کا حلف نامہ بھی تھا کہ پکوان حلال ہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں دوبارہ گزشتہ یاروں میں گم ہو گیا۔

پیرس باغ و بہار تھا۔ وہاں کی آب و ہوا میں شراب کی سی تاثیر تھی۔ فرانسیسیوں کی انگلش زبان سے بیگانگی اور اس کے بولنے والوں سے سرد مہری یاد آئی مگر ساتھ ہی پال اور دیانا کی میز بانی اور محبت تڑپا گئی۔ پٹھان نما جرمن کی ٹیکنیکل ترقی اور جرمن عوام کا ہندوستانی ثقافت سے لگاؤ یاد آیا۔ کوپن ہیگن کی حلیمی اور حشر سامانیاں یاد آئیں۔ لندن کے مضافات، ہمارے شہروں سے بہتر دیہات اور ہماری بہار سے زیادہ دلفریب خزاں نظروں میں گھوم گئی۔ کلکتے کی بستیوں سے گئے گزرے لندن کے محلے یاد آئے اور پنجابی، اردو اور بنگالی کی مقبولیت لندن میں نظر آئی۔ واشنگٹن کی صاف شفاف شاہراہیں اور جدید و قدیم عمارتیں نیز وہائٹ ہاؤس کے اندر کی مقناطیسی خاموشی اور باہر کا رنگ برنگی احتجاج اور "God is Dead" کا نعرہ کانوں میں گونجتا محسوس ہوا۔ نیویارک کی فلک بوس عمارتیں اور غلیظ زمین دوز ریل، چرسی سیاہ فام لونڈے اور سرخ رو دوشیزائیں خوش لباس بس ڈرائیور اور پولس والے یاد آئے۔

بقولِ انشاؔ جی :

منظر بھی حسیں ، چہرے بھی حسیں
ایسے کہ کبھی دیکھے بھی نہیں

اس آوارگی میں ہم نے صرف شہر اور مکانات ہی نہیں دیکھے بلکہ دامنِ دل تار تار کیا ہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی گھونٹ گھونٹ پیا ہے۔ دریائے سین، ٹیمز، مین، پوٹو میک وغیرہ وغیرہ۔ ہر جگہ پیاس بجھائی ہے۔ پاؤں میں چھالے اور آبلے پڑ چکے ہیں مگر بینڈ ایڈ کے سہارے چل رہے ہیں۔ باٹا کے جوتوں کی شکل بگڑ چکی ہے مگر اس کی قسمت اب تک نہیں بگڑی۔ نادان ناسمجھ جوتوں کو کیا معلوم کن کن خرابوں کی گرد اپنے سینے پر جمائے ہے۔ جہاز ۴۴۵ے فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہا ہے۔ لندن سے دہلی تک کا سفر کوئی نو گھنٹے کا ہے۔ میرا ذہن اس بلندی سے بھی کچھ اوپر فضاؤں میں

بھٹک رہا ہے۔

مجھے وہ تمام ساتھی یاد آ گئے جنہوں نے لائٹر سے لے کر کیمرے تک کی فرمائش کی تھی۔ کسی نے جین، کسی نے پرفیوم۔ ایک حضرت نے تو وی سی آر تک کا آرڈر دیا تھا۔ لانے کو تو میں وہائٹ ہاؤس تک اُٹھالاتا مگر مجھے کباڑیوں کے یہاں کتب بینی اور نوٹنکی دیکھنے سے فرصت ملتی تب نا۔ میں نے اتنا ضرور کیا کہ ایک سو صفحات کی رنگین کتاب مع تصویر جو ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور کی تھی اٹھالایا اور اپنے دل کو سمجھالیا کہ جس کسی نے شکوہ کیا فلاں چیز نہیں لائے تو اسے یہ کتاب بڑھادوں گا کہ ذرا تصویر اور قیمت پر نگاہ دوڑا لیں پھر بتائیں کہ کیا کیا اور کیونکر لاتا۔

خیالوں کے تانے بانے میں نو گھنٹے کا سفر اس طرح گزرا کہ پتہ بھی نہ چلا۔ ''اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما'' شاید ہندی میں بھی یہی پیغام سنایا گیا اور پتہ چلا ہم بمبئی پہنچ گئے ہیں۔ جیسے تیسے صبح سے شام کی اور سات بجے کلکتے کے لئے روانہ ہوا۔

محبوب بینڈ والوں سے دوستی ہوتی تو شاید وہ میرے استقبال کے لئے ڈھول تاشہ لے کر آتے۔ وہ نہیں آئے تو کیا ہوا۔ میرے چاہنے والوں نے پھولوں کے ہاروں، بھیگی پلکوں نے مجھے خوش آمدید کہا۔ چلئے صاحب خیر سے بدھو گھر کو آئے۔ ہاں بھئی بدھو نہ ہوتا تو واپس کیوں آتا۔ کسٹم والوں نے زیادہ پریشان نہ کیا۔ حیرت ضرور کی کہ اتنے بڑے سوٹ کیس میں صرف ایک سوٹ، بقیہ تمام میلے کپڑے، موزے، بنیان، چپل، کچھ الٹے سیدھے تحائف اور ڈھیر ساری کتابیں۔ ایک نے پوچھ ہی لیا کہ کیا آپ کی کتابوں کی دکان ہے یا کوئی لائبریری چلاتے ہیں۔ میں کیا کہتا سوائے مسکرانے کے:

چند تصویرِ بتاں ، چند حسینوں کے خطوط
بعد کسٹم مری پیٹی سے یہ ساماں نکلا

محلے والے دوست احباب بدنداں انگشت تھے کہ بھئی تم بالکل نہیں بدلے۔ جیسے گئے تھے ویسے ہی آ گئے۔ میں اب تک سمجھنے سے قاصر ہوں کہ میں کیا اور کیوں بدلتا۔

پھر وہی شہر، وہی لوگ اور وہی لوڈ شیڈنگ جو کلکتہ کی زندگی کا حصہ بن چکی ہے۔ میٹرو ریل کے خواب کی ادھوری تعبیر، مصنوعی مسکراہٹ، مصلحت آمیز خلوص اور ادبی چپقلش مگر مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ میں ٹھہرا آوارہ گرد۔ پھر نئی دنیا کی کھوج میں نکلنا میرا مقدر ہے ——— ایسا لگتا ہے کہ ایک طویل حسین خواب سے اچانک کسی نے چونکا دیا ہو......

کسی کو گھر سے نکلتے ہی مل گئی منزل
کوئی ہماری طرح عمر بھر سفر میں رہا

●●●